Title - MUTALEA HAFIZ.

Creator - Mohd. Ahtisham uddin Haqi Dehelvi.

Publisher - Barqi Press (Delhi).

Date - 1358 H.

Pages - 160

Subjects - Hafiz Sheerazi - Sawaneh-o-Tanqeed.

مطالعۂ حافظ

اور

اُس سے کیا مستنبط ہوتا ہے؟

از

محمد احتشام الدین حقی دہلوی (ایم۔ اے ایل ایل بی)

مطبوعہ ممبئی جوبلی ترقی پریس دہلی
۱۳۵۰ھ ہجری

ترجمان الغیب

لسان الغیب خواجہ حافظ شیرازی کی چھ سو غزلوں کا ہم قافیہ و ہم آہنگ اردو ترجمہ

از

مولوی محمد احتشام الدین صاحب حقی الدہلوی ایم - اے (علیگ)

جس کی نسبت

طبقۂ صوفیہ سے خواجہ حسن نظامی صاحب جو اہلِ قلم میں بھی بلند درجہ رکھتے ہیں تحریر فرماتے ہیں:-

کمال اس ترجمے میں یہ ہے کہ اصل فارسی کے بحر و قافیہ اور ہم آہنگ ردیف میں اردو ترجمہ کیا گیا ہے حافظ کے کلام کا ترنم اور زیر و بم اردو ترجمے میں موجود ہے اس ترجمہ (سے) نے یہ ثابت کر دیا کہ اردو میں ہر زبان کے اعلیٰ سے اعلیٰ اور مشکل سے مشکل مطالب کو ادا کرنے کی گنجائش موجود ہے مترجم کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔
(منادی ۱۱ جنوری ۱۹۳۹ء)

طبقۂ علما و اہل ادب سے مولوی محمد اسلم صاحب جیراجپوری رقم فرماتے ہیں:-

جس طرح خواجہ حافظ کی فارسی مستند اور مسلّم ہے اسی طرح مولانا احتشام الدین صاحب کی اردو خالص دہلوی اور ٹکسالی ہے جو لوگ خواجہ صاحب کے کلام سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے یہ ترجمہ نہایت دلکش ثابت ہوگا۔
(جامعہ مورخہ اپریل ۱۹۳۹ء)

طبقۂ اہل قلم و اہل ہنود سے پنڈت دتاتریا کیفی صاحب رقم طراز ہیں:-

مترجم نے ملک کی زبان پر ہی احسان نہیں کیا بلکہ جہاں تک نظم کا تعلق ہے ترجمہ کا نیا راستہ کھولا ہے جو بجائے خود جہد آفرین ہے ہندوستان فارسی سے نا آشنا ہوتا جا رہا ہے اور جہاں سے یہ زبان آئی تھی وہاں کی بولی ٹھولی اور ہو رہی ہے اس افراتفری کے زمانے میں یہ ترجمہ اصل کتاب کے مطالعہ سے بے نیاز کر دینے والا ہے

طبقۂ نسواں سے محترمہ انیسہ ہارون بیگم صاحبہ شروانیہ ان اشعار گوہر بار میں اظہار رائے فرماتی ہیں:-

اردو میں دیکھا دیوان حافظ	اللہ اکبر! اللہ اکبر!!
شیراز کی مے بانٹی گئی ہے	ہندوستانی ساغر میں بھر کر
کیا کم حلاوت تھی فارسی میں	اردو کا جامہ قند مکرر
آئے سمجھ میں اسرار مکنون	کیا ہاتھ آیا استاد رہبر
پہلے اگر تھا سربستہ غنچہ	چہکے گا اب یہ بن کر گل تر
ہوتی نہ ہرگز مشکل یہ آساں	ہوتا نہ یاور گر فضل داور

قیمت عہ ملنے کا پتہ: کتبخانہ علم و ادب دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مُطالعۂ حافظ

اور اُس سے کیا مستنبط ہوتا ہے؟

جو شہرت اور مقبولیت حضرت خواجہ حافظ شیراز رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کے کلام کو نصیب ہوئی کسی اور شاعر کے حصے میں نہیں آئی نہ وہ اس کی مصداق تھی کہ ؎

قدرِ شعرِ من بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن (غالب)

حضرت کے کلام کو اُن کی زندگی میں ہی لوگ تحفے کے طور پر لے جاتے تھے ؎

زبانِ کلکِ تو حافظ چہ شکرِ آں گوید کہ تحفۂ سخنت می برند دست بدست

یہ قدر دانی مُلکِ وطن تک ہی محدود نہ تھی دیگر اوطان و ممالک میں بھی آپ کا کلام نہ صرف پہونچتا تھا بلکہ اُس کی دُھوم سے محفلیں گونج رہی تھیں ؎

فگندہ زمزمۂ عشق در حجاز و عراق نوائے بانگ غزلہائے حافظِ شیراز

سخن آپ کا ایک فاتح کی طرح فتوحات میں مصروف تھا ؎

عراق و پارس گرفتی بشعرِ خود حافظ بیا کہ نوبتِ بغداد و وقت تبریز است

کشمیر و ختا و ختن میں آپ کے کلام پر رقص و سرود ہوتے تھے ؎

بہ شعرِ حافظِ شیراز می گویند و می رقصند سیہ چشمانِ کشمیری و ترکانِ سمرقندی

غرض ایشیا کے تمام ممالک میں جہاں فارسی زبان کی پہونچ تھی اور ایسے ممالک کم تھے جہاں اُس کی پہونچ نہ ہو۔ حافظ صاحب کے کلام کا آپ کی حیات میں نہ صرف وہاں پہونچنا بلکہ وہاں کے نغموں پر غالب آجانا بخوبی ثابت ہے ؎

حافظ حدیث سحر فریب خوشت رسید تا حدِ چین و شام و با قصائے روم و رے!

بنگال میں آپ کا کلام آپ کی زندگی میں پہونچ گیا تھا ؎

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند زیں قندِ پارسی کہ بہ بنگالہ میرود

سلطان محمود بہمنی نے آپ کے کلام کے ملاحظہ سے مشتاق ہو کر آپ کو دکن آنے کی دعوت دی تھی جس کے جواب میں آپ بھی جہاز میں بیٹھ کر روانہ ہونے کو تھے کہ طوفان آگیا اور قصد ترک کر دینا پڑا یہ شعر شاہد ہے ؎

بس آساں می نمود اوّل غمِ دریا بہ بوئے سود غلط کردم کہ یک موجش بہ صد گوہر نمی ارزد

لطائف اشرفی کا مؤلف جو اودھ کا باشندہ اور حضرت کا ہمعصر ہے آپ کے کلام کی تعریف و ثنا کرتے ہوئے آپ کے دیوان کا تذکرہ کرتا ہے جو اُس کی خبر کے بموجب حاجی قوام (وزیر شاہ بو اسحاق والی شیراز) نے جمع کر دیا تھا" اس سے آپ کے کلام کے آپ کی زندگی میں براہ دہلی شمالی ہند میں شایع ہو جانے کی شہادت بہم پہونچتی ہے۔

صدیوں پر صدیاں گذر جانے پر بھی آپ کے کلام کی شہرت اور ہر دلعزیزی میں فرق نہیں آیا بلکہ اُس کے حدود وسیع ہوتے رہے آخر اس نے یورپ اور نئی دنیا میں بھی قدم رکھا۔ کم شائستہ زبانیں ایسی ہیں جن میں ترجمہ ہو کر طبع نہ ہو چکا ہو بلکہ اسکو دیکھ کر یورپ کے نامور شاعر گیٹے نے آپ کی تقلید میں دیوان لکھا اور اُس کو دیوان ہی کے نام سے موسوم بھی کیا غالب کا یہ مصرعہ اسی پر صادق ہے ع

بلبلیں سُن کر مرے نالے غزلخواں ہو گئیں

ایک انگریز مستشرق نے چند سال ہوئے ہم سے ذکر کیا تھا کہ اُن کے ایک ہموطن فاضل کیمبرج میں سات برس سے دیوانِ حافظ کے مطالعہ میں مصروف ہیں اور اُن کا خیال ہے کہ حافظ میں شکسپیر سے (جو دنیا بھر کا مقبول و نامور شاعر ہی) زیادہ کمالات پائے جاتے ہیں" اس رائے کی نفی کا حق اُن لوگوں کو نہیں ہو سکتا جنھوں نے دیگر فضائل کے ساتھ کلام حافظ میں اتنے عرصۂ دراز تک غور و خوض نہیں کیا ہے اور شکسپیر اُن کی مادری زبان میں نہیں۔

فارسی کا کوئی ادیب و شاعر آپ کے بعد نہیں گذرا جو آپ کے خرمن کا خوشہ چین اور معترف نہ رہا ہو بلکہ آپ کے معاصرین میں سلمان ساوجی اور قاسم انوار جو بڑے بڑے شاعر گذرے ہیں آپ کے معترف کہے جاتے ہیں اس حد تک کہ قاسم انوار کی مجلسوں میں دیوان حافظ ہمیشہ پڑھا جاتا تھا۔

مولانا جامیؒ نے آپ کو ترجمان الاسرار اور آپ کی زبان کو لسان الغیب کا لقب دیا ہے اور نظیری نیشاپوری نے فخر سے کہا ہے کہ ؎

تا اقتدا بحافظ شیراز کردہ ایم   گر دید مقتدائے دو عالم کلام ما (نظیری)

صائب کا مصرعہ ہی کہ ؎ چو شعر حافظ شیراز انتخاب ندارد یعنی حافظ کے کلام سے کوئی بُرا شعر چھانٹ کر نکالنا غیر ممکن ہے" ایک اور موقع پر کہتا ہے ؎

کمال حافظ شیراز از رسا نہ صائب پُرس   کہ قدر گوہر شہوار جوہری داند (صائب)

شعرائے متمرّد کا فرعون عرفی بھی ہو کسی شاعر کو خطرے میں نہیں لاتا، یا اُستاد کہہ کر یہاں کان ٹیک دیتا ہے اور آپ کو قبلہ و کعبۂ سخن تسلیم کر کے آپ کے گرد طواف کرتا

طواف کرنے لگتا ہے ؎

بہ گردِ مرقدِ حافظ کہ کعبۂ سخن است　　　　در آمدیم بعزمِ طواف در پرواز (عرفی)

سوال ہو سکتا ہے کہ یہ لطف و لطافت حضرت کے کلام میں کہاں سے آئی جو ایسے ایسے ادبا و شعرا کو کان پکڑ لینے پر مجبور کر دیتی ہے! اس کا صرف ایک ہی سراغ آپ کے حالات میں ملتا ہے یعنی آپ حافظِ کلام اللہ تھے۔ بفحوائے ؎ جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد! کلام پاک کے وِرد و مزاولت سے یہ لطف و لطافت آپ کے کلام میں پیدا ہوئی کلام پاک کی تلاوت مدۃ العمر آپ کا عزیز ترین مشغلہ رہی آپ کے کلام سے ثابت ہے ؎

حافظا در کنجِ فقر و خلوتِ شبہائے تار　　　　تا بود وِردت دعا و درسِ قرآں غم مخور

ایک اور مقطع میں نصیحت فرماتے ہیں ؎

مرو بخواب کہ حافظ بہ بارگاہِ قبول　　　　ز وردِ نیم شب و درسِ صبحگاہ رسید

مکرر اس پر زور دیتے ہیں ؎

صبح خیزی و سلامت طلبی چوں حافظ　　　　ہرچہ کردم ہمہ از دولتِ قرآں کردم

غرض آپ قرآن شریف کے اس قدر شیفتہ و شائق اپنے کلام میں پائے جاتے ہیں کہ اگر ایک طرف اپنی کامیابیوں کی نسبت فرماتے ہیں کہ ؎ بر منتہائے مقصد دل کامراں شدم، تو دوسری جانب اپنی انتہائی کامیابی کا سہرا قرآن شریف کو دیتے ہیں ؎

ہرچہ کردم ہمہ از دولتِ قرآں کردم

بلاغت اور فصاحت اور حسنِ الفاظ و معانی کہ جو قرآن پاک کے اغیار کی نظر سے بھی مسلّمہ اوصاف ہیں اور مسلمان تو اُن کو اعجاز و معجزہ ہی تسلیم و ثابت کرتے ہیں، ایک شمّہ حافظ صاحب جیسے ذہین و ذکی کو اُس کے مُدّۃ العمر کے وِرد و مزاولت میں ملنا ضرور تھا۔

قرآن شریف کی یہ صفت مسلم ہے کہ از اوّل تا آخر نصیحت ہے جہاں سے کھول کر دیکھو نصیحت ہی نصیحت نکلتی ہے آپ کے کلام میں بھی بلا مبالغہ صدہا نصائح، اصول اخلاق، آداب معاشرت، رموز شریعت، اور اسرار طریقت لطیف و دلکش پیرایوں میں جابجا بکھرے نظر آتے ہیں جس طرح آپ کے پیشرو سعدی علیہ الرحمہ نے اپنے ملکۂ شاعری کو ضائع نہیں کیا گلستاں بوستاں میں اُس کو صرف کیا، حضرت کے کلام میں بھی مفید و سود مند اشعار و مطالب کی کثرت اور بہتات دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ آپ نے بھی اس عطیۂ فطرت کو بے کار نہیں جانے دیا اُس سے کام لیا اور مفید خلق بنانے میں سعی کی لیکن بہ طرز دیگر۔

حضرت سعدی ہی کا کھلا ناصحانہ انداز اختیار کرتے تو وہ کچھ بات نہ ہوتی علاوہ ازیں شیخ موصوف اس طرز کو ختم کر چکے تھے۔ نیز گلستاں و بوستاں کی پہونچ زیادہ نہ تھی مکتب میں ہی بالائے طاق چھوٹ جاتی ہیں لیکن حضرت کی دلکش اور دلفریب بحور دتوافی میں ساز موسیقی پر بجتی ہوئی رواں غزلیں اپنی مستی سے ہر محفل کی جان ہوتی ہیں، اور شاہد و مے کے لب و آواز اور سرود و ساز کے ذریعے اپنے پند و نصائح اُن موقعوں پر بھی جہاں کھلم کھلا نصیحت بے محل بلکہ موجب سرزنش ہوتی، بے تکلف پہنچا دیتی ہیں اور عیش کے بندوں کو لطف سے سنا ہی دیتی ہیں کہ ؎

خمار شب نشیناں را دوا کن ... خدا را گر مئے دوشینہ داری

قرآن کے اس حکم نے کہ "تمہاری ضرورتوں کے بعد جو بچے وہ مفلسوں محتاجوں کو خدا کی راہ دیدو" اس شعر کا پیرایہ اختیار کیا ہے۔ زائد از ضرورت مال مے دوشینہ ہے یعنی رات کی بچی ہوئی شراب، اور مفلسوں محتاجوں کی گرسنگی اور بیتابی کا خمار شب نشیناں میں اشارہ ہے، غرض زائد از ضرورت مال خدا کی راہ میں دینے کے

مشورۂ قرآنی کو جتانے کا پیرایہ اس سے بہتر ایسے مواقع کے لئے نہیں ہو سکتا جہاں دولت
شرابوں میں لنڈھ رہی ہو اور ضرورتوں سے بے تاب حاجتمندوں کی فریاد گوشش گزار
کرنے کا ذریعہ نغمہ و راگ ہی بنائے جا سکتے ہوں، سعدی کی اس مصلحانہ نصیحت کہ

نیم نانے گر خورد مرد خدا　　بذل درویشاں کند نیمے دگر

حافظ کی اس رندانہ نصیحت کا مقابلہ کر کے دیکھنا چاہیئے۔ سعدی کی نصیحت خشک
روٹی کے نوالے کی طرح حلق میں پھنستی ہے تو حافظ کی نصیحت شربت کا گھونٹ بن کر
حلق سے اُتر ہی جاتی ہے۔ وجہ اس فرق کی شیخ سعدی کی نصیحت کا مبالغہ بھی ہے
ایک ہی روٹی ہو تو اُس کا نصف کر دینے پر کوئی شرعی مجبوری نہیں زائد از ضرورت
کو دے دینے کا مشورہ اپنے اندر ایک قطعی استدلال رکھتا ہے جس سے فقط ایک
ہی اللہ آمین کی روٹی کو آدھا کر دینے کی نصیحت سعدی خالی معلوم ہوتی ہے۔

دل اندر زلف لیلیٰ بند و کارِ عشقِ مجنوں کُن　　کہ عاشق را زیاں دارد خیالاتِ خردمندی

بظاہر اس شعر میں شاہد پرستی اور عقل کو طلاق دیدینے کا مشورہ ہے لیکن غور کیجئے
تو انسان کو زندگی میں اپنے لئے کوئی فرض اور نصب العین مقرر کرنے اور اُس کی
دُھن میں مجنون ہو جانے کسی کی نہ سننے کی وہ گراں بہا نصیحت ہے جس پر عمل
مسلمانوں کی دو تین پشت میں فی زماننا صرف سید احمد خاں کی ذاتِ واحد نے
کیا کہ وہ اپنی مجنونانہ کوششوں سے وہ کام کر گئے جس کے منصوبوں کو سُنکر لوگ
اُن پر ہنستے اور اُس سے باز رہنے کے مشورے دیا کرتے تھے۔ سرسید اگر ان
خیالاتِ خردمندی میں پڑتے تو علی گڈھ اور جو کچھ اُس نے کام کیا کبھی ظہور میں نہ آتا۔

گر دیگراں بجاں غمِ جاناں خریدہ اند　　اے دل تو ایں معاملہ بارے بکن ؟

یہ بھی کسی معشوق مجازی پر جان نثار کر دینے کا مشورہ نہیں ہے بلکہ یاد دلایا ہے کہ انسان کو جان سے بھی دین یعنی اپنی قوم وملّت کی خدمت بجا لانی ضروری ہے بزرگوں نے اس کے لئے بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں کبھی تم نے بھی جان پر کھیل کر کوئی ایسی خدمت انجام دی یا عمر بھر کھاتے اور ڈکارتے ہی رہے؟ ؎

چہ شکر ہاست دریں شہر کہ قانع شدہ اند — شاہبازان طریقت بہ شکار مگسے؟

اہل اور قابل لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے کاموں کی وسعت و قابلیت رکھنے کے باوجود کوئی بڑا کام نہیں کرتے۔ مزخرفات میں تضیع اوقات کرتے ہیں حافظ صاحب تعجب فرماتے ہیں کہ شاہباز ہو کر یہ لوگ مکھیاں مارنے پر قناعت کئے بیٹھے ہیں۔ ؎

عاقبت منزل ما وادی خاموشانست — حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز

اس شعر میں ڈھول دماموں نفیری باجوں سے زمین و آسمان ہلا دینے کا مشورہ معلوم ہوتا ہے لیکن غور کیجئے تو یہ اس قسم کا شور مچانے کا مشورہ نہیں ہے بلند مقاصد اختیار کرنے کی صلاح ہے تیموروں اور سکندروں سے حضرت مخاطب ہیں اولوالعزمانہ کوششوں سے عالم میں وہ تہلکہ مچا دینے کے خواہشمند ہیں جس سے زمین و آسمان گونج اُٹھیں! خاموش زندگی بدتر از مرگ ہے خاک ہو جانے اور خاموشیٔ دوام میں پڑنے سے پیشتر لازم ہی نہیں بلکہ استحقاق ہے کہ تہلکہ مچائیں اور بلند ارادوں کا شور آسمان تک پہونچادیں ؎

من نگویم چہ کن و با کہ نشین۔ وچہ بنوش — کہ تو خود دانی اگر زیرک و عاقل باشی

اس ایک شعر میں حضرت نے گلستاں بوستاں دونوں ختم یعنی اخلاق و معاشرت کی تعلیم تمام کر دی ہے کچھ نہیں فرماتے اور سب کچھ کہہ دیتے ہیں نصیحت کا یہ پیرایہ اس

فن میں کمال کی حدّ و معراج ہے۔

خارج از امکان منصوبوں اور ناقابلِ عمل ارادوں میں الجھن اور دماغ سوزی کا بعض
کاہل طبیعتوں کو مرض ہو جاتا ہے بے ظہورِ عمل خیالات رفتہ رفتہ دماغ کو بے کار کر دیتے ہیں
اس کوہ کندن، اور ہیچ برآوردن کی مضرت سے حضرت کس حسن و لطافت کے ساتھ
آگاہ فرماتے ہیں ؎

مگر دیوانہ خواہم شد دریں سودا کہ شب تا روز — سخن با ماہ می گویم پری در خواب می بینم

ایسے پری پیکر نصائح سے دیوان پرستان اور رہبر ردیف ستاروں کی ایک
درخشاں انجمن ہے دیوان کیا ہے ایک نگار خانہ ہے جس میں بیش بہا اصول و نکات اور نصائح
و اسرار کے جواہرات پریاں بنے ہوئے مے و مینا و ساغر ہاتھ میں لئے مصروف رقص ہیں
اور ہوشمندوں کو اشعار کی یہ پھڑکتی ہوئی تصویریں دکھا کر نصیحت نیوشی کی صلائے عام
دے رہے ہیں ؎

بتے چوں ماہ زانو زد مے چوں لعل پیش آورد — تو گوئی تائبم حافظ ز ساقی شرم دار آخر

اس مقطع پر سادہ لوح قطعی گمان کر سکتا ہے کہ نہایت گمراہ کن اور رندانہ مشورے
کا شعر ہے، مگر حافظ صاحب کا چونکہ انداز معلوم ہے نیک دلی اور پاک خیالی جو علم و
انسانیت کا اعلیٰ جوہر ہے حضرت کو بزرگ جان کر اس شعر کا مطلب یوں سمجھتی ہے:۔

بتے چوں ماہ = ایک ایسا مجموعۂ اوصاف و خوبی رسول جو سلسلۂ انبیا میں
چاند بن کر چمکا، **زانو زد** = نہایت تواضع اور اخلاق کے ساتھ روبرو ہوا **مے چوں
لعل** = ایک نہایت لاجواب پُر کیف و معنی تعلیم و ہدایت جس نے دنیا کے دماغ پلٹ
دئے اور تختوں کے تختے اُلٹ دئے۔ **پیش آورد** = پیش کی۔

تو گوئی تا ئیم حافظ = اور تُو حافظ یہی کہے جاتا ہے بقول غالب ؎

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد پر طبیعت اِدھر نہیں آتی ؟

زساقی شرم دار آخر = خدا کی نہیں تو رسول کی شرم ضرور چاہئیے !

سماع میں صوفیہ آپ کے اشعار کا مطلب اِس طور پر سمجھ کر بے اختیار حق کا نعرہ لگاتے اور قلابازی کھا جاتے ہیں ! بلاشبہ اتنے رنگین پردوں میں پہونچ کر بات ایسی ہی تیز ہو جاتی ہے کہ اُس کا نشہ ہوشمند کو اُلٹ دیتا ہے۔ اس گہرے رنگ کے ایک اور شعر کو یہاں حل کر کے دکھانا ضرورت سے زیادہ نہیں ہو سکتا کہ مقصد اس سے حافظ صاحب کے طرز ادا کا ذہن نشین کرنا ہے بغیر اس کے نہ آپ کا کلام سمجھ میں آسکتا ہے نہ آپ کی خصلت و مزاج پر روشنی پڑ سکتی ہے ۔ ؎

دیشب گلۂ زلف با باد صبا گفتم گفتا غلطی بگذر زین فکرت سودائی

اگر شعر کے معنی صرف یہی ہیں کہ زلف کا خیال چھوڑ دے کہ یہ دیوانہ پن ہے" تو محض معمولی بات ہے کچھ لطف نہیں ، اور نہ ان دعووں پر شعر میں کوئی دلیل ہے کہ جھوٹ کیوں ہے اور غلطی کس لئے ؟

لیکن اگر شعر کو یوں سمجھیں کہ صبا زبان محبت میں پیغامبر قرار دی گئی ہے یعنی رسول اور زلف ایک جھمیلے کی چیز لہٰذا عذاب ، صوفیہ اِس سے دنیا کے جھگڑے اور عذاب آخرت مراد لیتے ہیں جس کے ہَول سے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا یہ احوال تھا کہ نیندیں اُڑ گئی تھیں زندگی تلخ تھی ہر وقت ترساں و ہراساں رہتے تھے روتے روتے کلّوں پر آنسوؤں کے نشان پڑ گئے تھے۔ اس حالت کی خبر حضرت رسول اللہ صلعم کو دی گئی تو آپ نے لوگوں کی تسکین فرمائی اور خدا کی طرف سے بھی لا تخافوا ولا تحزنوا کی تاکید و تنبیہ

نازل ہوئی بعد آیۃ لا تقنطوا من رحمت اللہ اور ان اللہ یغفر الذنوب جمیعاً مستزاد فرمائی گئی اخیر بشارت من قال لا الٰہ الا اللہ کی منادی کا حکم ہوا ان تمام واقعات کا نچوڑ اس شعر میں ہے کہ دلیشب گلہ زلفت با باد صبا گفتم الخ۔ بشارت من قال کو حضرت عمرؓ نے خلاف مصلحت عرض کر کے رکوا دیا" اس کا اعلان نہ ہونے دینے کی طرف حضرت نے کیا بلیغ اشارہ فرمایا ہے کہتے ہیں۔ ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ در محفل رنداں خبرے نیست کہ نیست

ایک اور شعر میں آیات رحمت و تخویف کے تضاد و کشمکش اور ان کے صحیح مفہوم کی نزاکت کو کس خوبی سے آشکارا کیا ہے فرماتے ہیں ؎

گرچہ میگفت کہ زارت بکشم می دیدم کہ نہانش نظرے با من دل سوختہ بود

حسن ظن جو علم و انسانیت کا اعلیٰ زیور ہے اگر طبیعت میں موجود ہو تو حضرت کے کلام کی ان بلیغ معانی میں تشریح کو تسلیم کرنے میں کوئی دشواری نہیں بلکہ مجاز سے گذر کر حقیقت پر ان کی تطبیق میں زیادہ لطف ملتا ہے فی الحقیقت آپ کے کلام کا اعجاز و خوبی اسی میں مضمر ہے کہ اس کا مفہوم و مدعا دونوں طرف چسپاں اور منطبق ہوتا ہے اپنی بابتہ اس خیال کے حضرت اپنے اس شعر میں خود شاہد نظر آتے ہیں۔ ؎

حافظم در مجلسے دُردی کشم در محفلے بنگر ایں شوخی کہ چوں با خلق صنعت میکنم

حسن ظن کا حامی وا اگر کسی طبیعت کو علم و انسانیت نے عطا نہ کیا ہو تو صاف اشعار بھی آپ کے بہت سے موجود ہیں جن سے حضرت کی اصطلاحات مے کشی وغیرہ کے معنی مقرر و متعین کئے جا سکتے ہیں مثلاً۔

سر نہاں کہ عارف و سالک بکس نگفت در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

کون انکار کر سکتا ہے کہ اس شعر میں صبح شب معراج کی تمام کیفیت ایک مجذوب

کی زبانی سن کر آنحضرت صلعم کے تعجب فرمانے کی مشہور روایت کی طرف اشارہ نہیں ہے بہیں
اس شعر میں بادہ فروش کے معنی متعین کئے جا سکتے ہیں حافظ صاحب کی اصطلاح یا حافظ اللغات
میں بہت جگہ بادہ فروش قلندر و مجذوب کو کہا گیا ہے ضمناً بادہ کے معنی پر بھی روشنی پڑتی ہے

ایسے اور بھی اشعار دیوان سے برآمد کئے جا سکتے ہیں جن سے بیشتر حصہ دیوان کی جو ایک خمخانہ ہے اصطلاحات کے معنی متعین ہو جاتے ہیں گویا حافظ صاحب کے میخانے کی کنجی ہاتھ آجاتی ہے مثلاً فرماتے ہیں ؎

نگار ما کہ بمکتب نہ رفت و خط نہ نوشت　　بغمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

صرف آنحضرت صلعم کی ذات بالا از صفات پر دنیا میں یہ تعریف صادق آسکتی ہے کہ آپ کو کبھی لکھنے پڑھنے مکتب مدرسہ میں بیٹھنے کا اتفاق نہیں ہوا تاہم آپ کے ایک ایک قول و فعل اور عادات اخلاق و انداز بلکہ خاموشی تک سے صدہا مسائل شریعت اور اصول فقہ پیدا اور متفرع ہو گئے جن کی بحث و گفتگو میں فقہا اور محدثین کی عمریں صرف ہو گئی ہیں۔ لہذا اس شعر میں نگار کا لفظ پیغمبر خدا صلعم کے واسطے اور آپ کے اسوۂ حسنہ کے لئے لفظ غمزہ سے کام لے کر حضرت نے گستاخی کو تنبیہہ کر دی ہے کہ ان کے نگار کو عام معشوق اور اس کے غمزے کو معشوق بازاری کا نخرہ سمجھ کر آپ کی نسبت رندی کے خیالات سے پرہیز کرنا چاہیئے چنانچہ ایک مقطع میں اس کو صاف صاف بھی کہدیا ہے ؎

دوستاں عیب نظر بازیٔ حافظ مکنید　　کہ من او را از محبان خدا می بینم

حضرت کا مشہور و معروف مطلع ہے ؎

غلام نرگس مست تو تاجدار انند　　خراب بادۂ لعل تو ہوشیارانند

اس میں اگرچہ کوئی ایسا صاف و صریح اشارہ نہیں جیسا کہ "بمکتب نہ رفت و خط نہ نوشت"

میں پیدا تھا لیکن غور کیا جائے تو ایسی ہستی جس کے غلام تاجدار بھی ہوں اور ایسی تعلیم (بادۂ لعل) جس کے مست حکیم و ہوشیار بھی ہوں اور ہر زمانے میں متواتر ہوتے چلے آئے ہوں تاریخ اسلام میں سوائے پیغمبر اسلام صلعم اور ان کی تعلیم و ہدایت کے کوئی اور قرار نہیں پا سکتی اور بہت آسانی سے یہ شعر نعت میں سمجھا جا سکتا ہے۔

اِس قسم کے عاشقانہ استعارات اور شاعرانہ طرزِ ادا میں حضرت کے صدہا اشعار حمد و نعت میں بلا اظہار اسم ممدوح موجود ہیں مثلاً ان اشعار کو حمد و نعت میں سمجھنے کا ہر ایک قرینہ خود اشعار میں پیدا اور اُس کے برعکس سمجھنے میں موانع معنوی حائل ہیں ؎

آں پیکِ نامور کہ رسید از دیارِ دوست — آورد حرزِ جاں بخطِ مشکبارِ دوست

خوش می دہد نشانِ جلال و جمالِ یار — خوش می کند حکایتِ عزّ و وقارِ دوست

شکرِ خدا کہ از مددِ بخت کارساز — بر حسبِ مدعاست ہمہ کاروبارِ دوست

سیرِ سپہر و دورِ قمر را چہ اختیار — در گردشند بر حسبِ اختیارِ دوست

شعر اول۔ پیک رسول کو کہتے ہیں رسول بہت سے گذرے ہیں پیک بہت ہوئے ہیں مگر اُن میں خصوصیت کے ساتھ نامور ذات بابرکات حضرت رسول صلعم یعنی مسلمانوں کے مسلمہ پیغمبر خاتم الانبیا کی تسلیم کی جاتی ہے۔ ایسی ناموری اور شہرت کسی نبی کو دنیا میں اِن صدیوں میں نصیب نہیں ہوئی کہ مشرق سے لے کر مغرب تک روزانہ پنجوقتہ اذانوں میں پکارا جاتا ہو! اِس نامور کے لفظ نے اس مطلع کو نعت بنا دیا ہے اگر کچھ کسر رہ جاتی ہے تو وہ "آورد حرزِ جاں" سے پوری ہو جاتی ہے جس سے مراد قرآن پاک کا آپ کے ذریعہ منزل ہونا اور تعریف اُس کی خود قرآن ہی میں "فیہ شفاء للناس" وارد ہوئی ہے اور حرزِ جان اِس کا فارسی میں ترجمہ ہے بخطِ مشکبارِ دوست

سے اُس کا خاص کلام خُدا ہونا مراد ہے۔

شعرِ دوئم۔ ؎ خوش می دہد نشان جلال و جمال یار الخ" یہ بھی اِن معانی
میں ہے یا نہیں؟ اِس کے لئے کلام پاک کی اُن آیات و الفاظ کو دیکھنا چاہیے۔
جس میں اللہ تعالےٰ کے اوصاف بیان ہوئے ہیں مثلاً "لا الٰہ الا ھُو الحی القیوم"
"الخالق الباری المصور" "لہ الاسماء الحسنیٰ" "الواحد القہار" "ذوالجلال و
الاکرام" "عزیز الجبار المتکبر" "نور فی السمٰوات والارض" "الرحمٰن الرحیم"
وغیرہ کہ اِن سے بہتر تعریف و بیان جلال و جمالِ یار کا نیز اِس کثرت و فصاحت سے
کسی اور کتاب یا صحیفہ آسمانی یا غیر آسمانی میں نہیں پایا جائے گا پس اِس میں شک نہیں
کہ دوسرا شعر بھی حمد و نعت میں ہے۔

شعرِ سوئم۔ ؎ شکرِ خدا کہ از مددِ بخت کارساز الخ" اِس شعر میں کوئی خصوصیت کا
اشارہ آنحضرت صلعم کی طرف نہیں تاوقتیکہ یہ ذہن نشیں پہلے سے نہ ہو کہ اِس شعر
میں تمام کاروبارِ دوست کو بر حسب مدعا" ظاہر فرما کر حضرت حافظ اسلام کے اُس
عروج و اقتدار اور انتہائی وسعت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو سب زمانوں سے
زیادہ آپ کے عہد میں اَوجِ کمال پر پہونچ گئی تھی۔ امیر تیمور صاحبقراں نے مشرق
میں اقصائے چین تک اور شمال میں روس تک غلبہ حاصل کر رکھا تھا قطب شمالی کے
دائرے کے قریب پہونچکر اپنے لشکر ذخار سے عملاً اذانیں دلوائیں تھیں جن کے شور
سے سائبیریا کے دشت و جبل نام حق سے واقعی گونج اُٹھے تھے۔ اُدھر مغرب یعنی
یورپ میں ترکوں کے دم قدم سے ویانا تختگاہ آسٹریا محصور ہو رہا تھا اور اُس کے
زیر دیوار تک اسلامی حدود کی وسعت پہونچ گئی تھی ہنگری وغیرہ بلقانی ریاستیں اسلامی سلاطین کے زیر

ہسپانیہ بھی بخوبی تمام مسلمانوں کے قبضے میں تھا مصر و شام و افریقہ تا جزائر ہند
ادھر آسام سے غزنین تک، اور اُدھر تبت و کشمیر سے دکن تک تمام ہندوستان پر
مسلمان چھائے ہوئے تھے، اس کماری کی ناک پر علاء الدین خلجی نے مسجد تعمیر کرائی تھی
غرض اللہ اکبر کی آوازیں چار دانگ عالم میں گونج رہی تھیں ایسے عروج و اقتدار
کے زمانے میں ایک حمد و نعت کی غزل کا یہ شعر کس قدر حسب حال اور اُس کے
معانی واقعات زمانہ پر اسلامی نقطۂ نظر سے کس قدر چسپت اور مطابق ہیں کہ ؎

شکر خدا کہ از مدد بخت کارساز   بر حسب مدعاست ہمہ کار و بار دوست

شعر چہارم "سپہر و دور قمر را چہ اختیار الخ" میں تو کوئی شک ہی نہیں ہو سکتا
کہ قرآن کی آیات (والشمس تجری لمستقر لھا الخ اور والقمر قدرناہا منازل اور ذالک
تقدیر العزیز الحکیم) کا یہ شعر فارسی پیرایہ ہے۔ لولاک لما خلقت الافلاک کی بھی ایک جھلک
اس میں پائی جاتی ہے۔

الغرض ان اشعار کے معنی حمد و نعت کے لئے اس قدر خاص و مخصوص ہیں کہ اگر
حمد و نعت کے دائرے سے کھینچ کر زبردستی ان کو باہر لے جانے کی کوشش کریں
اور دوسری طرح ان کو تطبیق دیں تو معانی کی وسعت کم ہو کر ان کے لطف میں بھی
کمی آجاتی ہے۔ اور ؎ "در گردش اند بر حسب اختیار دوست" میں دوست کو شعرا
کا عام معشوق سمجھا جائے تو شعر ایک مضحکہ انگیز مبالغہ رہ جاتا ہے۔

حضرت کے نصائح اور مدح و ذم اور نکتہ چینی کے مخاطب خلق کے تمام طبقات
ہیں:- اول بادشاہ اور امراء جن کے اخلاق سے خلق کے اخلاق ہر زمانے میں اثر
پذیر ہوتے رہے ہیں اکثر کلام آپ کا بادشاہوں اور امیروں وزیروں سے ہی خطاب

میں ہے۔ بادشاہوں کو آپ کا اندازِ نصیحت بھی شاہانہ ہے مثلاً خوشخوئی کی تعلیم و نصیحت حضرت شیخ سعدیؒ کے کلام میں اس سادگی کے ساتھ ہے :۔ ؎

بہ شیریں زبانی و لطف و خوشی تو آنی کہ پیلے بہ موئے کشی

اِس نصیحت کا انداز شاہانہ بادشاہوں کو۔ حضرت کے شاہوار اشعار میں قابل دید ہے مثلاً فرماتے ہیں ؎

ایں طرّہ کہ ہر مویش صد نافۂ چیں ارزد خوش بود ے اگر بود ے بوئیش ز خوشخوئی

خود بدولت کے بجائے اُن کے طرّہ پر رکھ کر کہتے ہیں کہ طرّہ کس قدر بانکا اور طرّہ کے بالوں کی سیاہی کیسی رشکِ مشکِ ختن ہے لیکن اینٹھ مروڑ کے سوا، اس میں مشک کا فقط رنگ ہی رنگ ہے۔ خوشبو نام کو نہیں، کیا اچھا ہوتا اگر اس میں کچھ مہک یعنی خوشخوئی بھی ہوتی کہ مشک سے اس کی نسبت پوری ہو جاتی :

مطلق العنان بادشاہوں کے غیظ و غضب سے ایک تہلکہ کارو بارِ خلق و حکومت میں پڑ جاتا تھا حضرت نصیحت فرماتے ہیں کہ لطف سے بھی وہی کام نکل سکتا ہے جو غیظ و غضب ڈھانے سے۔ اس نصیحت کا انداز یہ ہے ؎

دل عالمے بسوزی چو عذار بر فروزی تو ازیں چہ سود داری کہ نمی کنی مدارا؟

اہلِ قدرت و حکومت اپنے دوستوں وفاداروں سے ادنیٰ بات پر خفا ہو کر اُن کو سخت معتوب کر دیتے ہیں، اور عمرۃ العمر کی خدمات صرف ایک خطا و فروگذاشت پر فراموش کر دی جاتی ہیں حضرت خواجہ حافظ ایسے مظلوم معتوبوں کی اُن کے ناقدرے آقاؤں سے کس دردمندی کے ساتھ سفارش فرماتے ہیں ؎

اے خواجہ باز بیں بترحم غلام را اورا برآستان تو بس حق خدمت است

بادشاہ نصیحت نیوشی سے گریز کرتا ہے یا اُس تک نصیحت کے لئے پہونچ اور رسائی ناممکن ہوتی ہے تو اُس کی مجلس میں گانے کے لئے ایک غزل تیار کرکے اکثر اُس میں دو ایک شعر پند و نصیحت کے ٹانک دیتے ہیں ذیل کے شعر میں کس ندرت کے ساتھ چنگ کو اُس کی وضع و ساخت کے لحاظ سے پیر خمیدہ قامت قرار دے کر اُس کی زبانِ حال سے بادشاہ کو نصیحت نیوشی کی (جو سو نصیحتوں کی ایک نصیحت ہے) تعلیم دیتے ہیں ۔

چنگِ خمیدہ قامت میخواندت بعشرت　　بشنو کہ پندِ پیراں ہیچت زیاں ندارد

ظاہری معنی یہ ہیں کہ چنگ بجنا شروع ہوا وہ تجھ کو بزم عشرت کی طرف پکار رہا ہے اگر اُس کی یہ بات مان لی جائے یعنی بزم عشرت میں آپ تشریف لے آئیں تو کچھ نقصان نہیں ہے یعنی بزم سرود کوئی نقصان نہ دے گی"۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ چنگ خمیدہ قامت تجھے عین عشرت میں پکار پکار کر پیشار ہا ہے کہ ۔

بشنو کہ پندِ پیراں ہیچت زیاں ندارد

اس مصرعے کی آواز چنگ کے سُروں کی گونج سے بہت مماثل ہے ۔ یہ مزید لطف ہے ۔

انتظام ملک میں ایک ایسا وقت آجاتا ہے کہ اہل و قابل لوگ خانہ نشین اور ناقابل و نااہل لوگ امور سلطنت میں اُن کے جانشین بن جاتے ہیں اُن کی نازیبا حرکات سے خلق کا ناک میں دم ہو جاتا ہے ۔ حضرت شعر ذیل کے ذریعہ اس حالت کی اصلاح کی طرف بادشاہ کو توجہ دلاتے ہیں ۔

پری نہفتہ رخ و دیو در کرشمۂ ناز　　دلم بسوخت ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

ایک بار شاہ جنگجو مزاج کا معلوم ہوتا ہے خورہ نخورہ لڑائی نکالتا ہے ایک معرکے سے ابھی بال بال بچ کر آیا ہے دوسرے کی شاید تیاری میں ہے حضرت اُس کو سمجھاتے ہیں :-

خوش کرد یاوری فلکت روز داوری　　تا شکر چوں کنی و چہ شکرانہ آوری

در شاہراہِ جاہ و بزرگی خطر بسیست　　آں بہ کزیں کریوہ سبکبار بگذری

یک حرف صوفیانہ بگویم اجازت ست ؟　　اے نور دیدہ صلح بہ از جنگ و داوری

ایک نو عمر بادشاہ زین العابدین پسر شاہ شجاع جو تیرہ برس کی عمر میں باپ کا جانشین ہو گیا تھا امیر تیمور کو جو دولت اور صاحبقرانی کو اپنا حق سمجھ کر خاطر میں نہیں لاتا سمرقند و بخارا کو جو امیر کے پایۂ تخت اور اُس عہد کے گویا پیرس و لندن تھے بہ یک حملہ امیر سے چھین کر اُس کی جگہ آدھی دنیا کا بادشاہ ہو جانا چاہتا ہے چنانچہ اِس حملے کی تیاری اور منصوبوں میں مصروف ہے۔ ترک نژاد مگر شیراز کی پیدائش ہے حضرت ایک پیر کہن سال اور اُس نو عمر کے خیر خواہِ خاندان ہیں بخوبی سمجھتے ہیں کہ امیر تیمور جیسے فاتح اعظم کے ساتھ اُلجھنے کا انجام کیا ہوگا سمرقند و بخارا کو جن کی دھن میں وہ نو عمر غرقاب ہے اُس کے صرف خالِ رخسار کا صدقہ بنا کر اُس کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اِس حوصلے سے باز آنے کی نصیحت اِس عظیم الشان مطلع اور حسن مطلع میں فرماتے ہیں ؎

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا　　بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

نصیحت گوش کن جانا کہ از جاں دوست تر دارند　　جوانان سعادتمند پند پیر دانا را

مطلب یہ ہے کہ اگر وہ ترک شیرازی ہمارا دل مٹھی میں لے تو ہماری نصیحت مانے تو اُس کی جان تو بہت بڑی چیز ہے سمرقند و بخارا اُس کے صرف خال رخسار پر

پر تصدق کر دینے کے قابل ہیں غالباً زبانی نصیحت اس کان سن کر اس کان اڑا دی گئی تھی کہ حضرت کو غزل کے ذریعہ اس کے کانوں میں ڈھول پیٹنے کی ضرورت محسوس ہوئی سخن فہموں پر مخفی نہیں ہے کہ یہ مطلع اور تمام غزل کس عظمت و شان کی ہے۔ حضرت کے قلم سے نکلتے ہی شیراز کے گلی کوچے اور بادشاہ و امرا کی محفلیں اس کے نغمے سے گونج اٹھی ہوں گی اور بادشاہ اور اس کے مشیروں کو ہر طرف سے اسی کی آوازیں آنے لگی ہوں گی شاعری کے ذریعہ سیاسیات عہد کو متاثر کرنے کی یہ اور اور بہت سی مثالیں دیوان میں جا بجا بکھری ہوئی ملتی ہیں ایک ابھی مذکور ہو چکی ہے کہ ؏ اے نور دیدہ صلح بہ از جنگ داوری!

بادشاہ لہو و لعب کا بندہ ہے اس کی غفلت سے ملک اور کاروبار سلطنت میں فتنے نمودار ہو رہے ہیں یہ فتنے تیری ہی عیش پرستی سے ہیں" اس کو حضرت اس دلچسپ اور ذو جہت و ذو معنی مطلع میں اس کے ذہن نشیں فرماتے ہیں ؎

تو مگر بر لب جوئے ز ہوس بنشینی ، ورنہ ہر فتنہ کہ بینی ہمہ از خود بینی

مطلب یہ کہ نہروں کے کنارے تو لہو و لعب میں مست نہ رہ ورنہ جو فتنے اٹھیں گے ان کا باعث اپنی ہی ذات کو سمجھو" اس بادشاہ کے ندیم و جلیس بد نہاد لوگ ہیں آپ ان کی صحبت سے کس بزرگانہ اور مشفقانہ طریق و انداز میں اس کو باز رکھنے اور باز رہنے کی نصیحت فرماتے ہیں ؎

عجب از لطف تو اے گل کہ نشینی با خار ظاہراً مصلحت وقت در آں می بینی

سخن بے غرض از بندۂ مخلص بشنو اے کہ منظور بزرگان حقیقت بینی

نازنینے چو تو پاکیزہ رخ و نیک نہاد بہتر آنست کہ با مردم بد ننشینی

سیر و تماشا سے اُس کو روکتے ہیں اسی طرح جیسے ہم آجکل بچوں کو سنیما وغیرہ سے روکتے ہیں ؎

حیفم آید کہ خرامی بہ تماشائے چمن | تو کہ خوشتر ز گل و تازہ تر از نسرینی

شیشہ بازی سترسکم زچپ و راست نگر | گر بدیں منظرِ بینش نفسے بنشینی

تو بدیں نازکی و دلکشی اے مایۂ حسن | لایق بزمگہ خواجہ جلال الدینی

خواجہ جلال الدین اِس لڑکے بادشاہ کے باپ کے دانا وزیر اور اس کے ادیب و اتالیق تھے۔ اِسی غفلت شعار کو وقت و فرصت کی قدر و قیمت سمجھاتے ہیں ؎

وقت را غنیمت داں آنقدر کہ بتوانی | حاصلِ عمر اے جاں یکدم است تا دانی

یہ بادشاہ جلد باز مغلوب الغضب نا عاقبت اندیش بھی ہے اور اُس سے جانوں کو خطرہ ہے آپ سمجھاتے ہیں ؎

میروی و مژگانت خونِ خلق میریزد | تند میروی جانا ترسمت فرو مانی

لہو و لعب سے باز رہنے کی کیسے موثر الحاح کے ساتھ نصیحت فرماتے ہیں

پندِ عاشقاں بشنو و ز طرب باز آ | کیں ہمہ نمی ارزد شغلِ عالمِ فانی

خزانہ وافر اور آمدنی کافی ہونے کے باوجود یہ لڑکے بادشاہ بالطبع کنجوس واقع ہوئے تھے نتیجہ اُن کی خست کا یہ ہوا کہ امرا وغیرہ اُس کے حریفوں کے طرفدار ہونے لگے آپ اسے فیاضانہ طرز اختیار کرنے پر اپنے خاص انداز میں توجہ دلاتے اور مصلحت سمجھاتے ہیں ؎

اے نورِ چشم من سخنے ہست گوش کن | تا ساغرت پُر است بنوشاں و نوش کن

پیراں سخن بتجربہ گفتند گفتمت | ہاں اے پسر کہ پیر شوی پند گوش کن

بادشاہ اگر فقیر کے مرتبے کی عزت ملحوظ نہیں رکھیں تو حضرت بھی اُن کو کھری سنانے پر

اور کیسے عبرت آموز پیرائے میں ؎

کہ بردہ نبرد شاہاں زمن گدا پیامے　　　　کہ بکوئے میفروشاں دو ہزار جم بجامے!

یعنی جا کر کہدے کوئی بادشاہ سے غرور نکر! تجھ سے بڑھ کر بادشاہ جہاہ اس دنیا میں اتنے بے تعداد و بے شمار گزر چکے ہیں کہ ایک ایک جام سفالی کی سرشت میں دو دو ہزار جسم کے ذرات خاک شامل ہوں تو عجب نہیں! دوسری تنبیہہ یہ بھی ہے کہ تو تو مغرور ہے ہی مگر ہمارے بھی ایک ایک جام میں دو دو ہزار جمشید کا نشۂ غرور بھرا ہوا ہے۔ تیسری ڈانٹ یہ ہے کہ ہم ایک جام مست ہوکر دو ہزار جمشید کی حقیقت نہیں سمجھتے۔ چوتھی سرزنش یہ ہے کہ ایک ایک جام کی قیمت دو دو ہزار جم ہیں یا ایک ایک جام کے دو دو ہزار جمشید غلام ہیں!

ایک اور موقع پر اسی طرح بگڑ کر بادشاہ کو استغنا کا نوٹس دیتے ہیں ؎

شاہ گرجرعۂ رندان نہ بحرمت نوشد　　　　التفاتش بمے صاف و مروّق نکنیم

فقیروں سرپھروں سے الجھ جانا کبھی کبھی بادشاہوں اور نگریوں سے ظہور میں آجاتا ہے آپ اُس سے حذر کرنے اور باز رہنے کی تنبیہہ فرماتے ہیں ؎

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات　　　　با دُرد کشاں ہر کہ در افتاد بر افتاد

اس تفصیل اور ان مثالوں سے جو حضرت کے اُس حصۂ کلام سے نقل ہوئی ہیں جس میں بادشاہ سے مخاطبت کا خاص اشارہ موجود ہے، بخوبی ظاہر ہے کہ حضرت اپنی غزلیات سے صرف اُن کا دل ہی نہیں بہلاتے بلکہ اُن کو نہایت کار آمد نصیحتیں اور مشورے بھی دلکش پیرایوں میں موقعہ بموقعہ سُناتے رہتے ہیں اور مطلق العنانوں کی روک تھام کے لئے نصیحت آمیز اشعار کی مرصع شام لئے اکثر تیار رہتے ہیں فی الجملہ حضرتؒ بادشاہوں کے تمام امور

ومعاملات سلطنت مشورہ صلح و جنگ، حکم احکام نیز ذاتی اطوار و عادات غرض ہر امر میں ناصح نظر آتے ہیں۔ بعض اوقات صاف جھڑک بھی دیتے ہیں ؎

ما آبروئے فقر و قناعت نمی بریم ۔۔۔ با پادشاہ بگوئے کہ روزی مقدر است

تاہم بعض بہادر معترضین جنہوں نے مطلق العنان بادشاہ کے عہد و قرب میں زندگی بسر کرنا تو کجا کبھی اس کی صورت بھی اس انگریزی زمانے میں نہ دیکھی ہو گی حضرت کو اس مقطع کی بنیاد پر جبن و بزدلی کا الزام دیتے ہیں ؎

رموز مملکت خویش خسرواں دانند ۔۔۔ گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

یہ شعر قصہ طلب ہے۔ قصے سے سر دست قطع نظر، خود شعر میں ہی غور کرنے سے یہ ثابت ہے کہ حضرت خلق کے متعدد و مختلف طبقات میں سے صرف گدائے گوشہ نشین کو سیاسیات میں دخل دینے سے منع فرماتے ہیں گدائے گوشہ نشین اہل دین میں سے یہ وہ طبقہ ہے جس کو (حافظ صاحب کے زمانے کے کئی سو برس بعد آج) بڑی بڑی مجالس ملی و ملکی میں کچھ اثر و اقتدار باقی رکھنے کے بجائے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا گیا ہے۔ فرانس کے چیمبر آف ڈپوٹیز سے علمائے دین اور پادری صاحبان ہماری آنکھوں دیکھتے چن چن کر نکال دیئے گئے ایسا ہی اب جرمنی میں ہوا ہے اور روس میں اس سے پہلے ہو چکا تھا گدائے گوشہ نشین کا اصل مقصد حصول عرفان ہے۔ سیاسیات میں پڑ کر درویشی کے شغل اشغال و دھیان گیان وغیرہ پھر کہاں! اصلی مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ مگر درویش و بادشاہ کے درمیان ہزارہا طبقات خلق ہیں جن میں کسی کو حضرت سیاسیات میں دخل دینے سے منع نہیں فرماتے اور گدائے گوشہ نشین کو بھی بوجہ معقول معذور رکھتے ہیں"۔

الغرض اصول کی غلط تعلیم امعان نظر سے آپ کے کلام میں نہیں پائی جاتی اور پُچین بُزدلی کا الزام اُنہی پر عائد رہ جاتا ہے جنہوں نے کسی مطلق العنان بادشاہ سے تو کیا اپنے علاقے کے تھانیدار سے بھی آنکھ ملا کر بات کرنے کی کبھی ہمت نہ کی ہو گی۔

حضرت بذاتِ خود اپنے کلام میں ایسی دلچسپ صورتوں اور حلیوں میں نمایاں اور پیشِ نظر رہتے ہیں کہ بہت بڑی دلکشی آپ کے کلام کی آپ کی دلاویز شخصیت سے منسوب ہو سکتی ہے لیکن اس خود نمائی میں وصف یہ ہے کہ اس میں عرفی، فیضی، اور غالب جیسے تعلّی باز شعرا کی سی انانیت نہیں۔ عرفی کا نام لے دینا کافی ہے مثال دینے کی ضرورت نہیں۔ فیضی فیّاضی بڑ مارتے ہیں ؂

حریفِ خلوتِ من عقلِ ذو فنونِ من است یقین نتہیاں اولین ظنونِ من است

غالب اپنا ڈھول پیٹتے ہیں ؂۔

غالب نام آورم، نام و نشانم مپرس ہم اسدُ اللّٰہم و ہم اسد اللّٰہیم

حضرت کی تعلّیاں اس قسم کی نہیں ہوتیں۔ بڑی سے بڑی اپنی تعریف فرماتے ہیں مگر وہ خلافِ واقعہ اور ناگوار نہیں ہوتی، عدمِ ناگواری کی وجہ اپنی نسبت ادّعا کا واقعی اور روا بھی ہونا ہے مثلاً فرماتے ہیں ؂

چہ جائے گفتۂ خواجہ و گفتۂ سلماں کہ شعرِ حافظِ شیراز بہ ز شعرِ ظہیر

یہ ظہیر وہ مشہور شاعر ہے جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ ؂

دیوانِ ظہیرِ فاریابی در مکہ بدزد اگر بیابی!

یعنی اس کے کلام کی چوری خانۂ کعبہ میں بھی جائز ہے!

تاہم حافظ صاحب کا دعویٰ ذرا بھی خلاف واقعہ نہیں۔ آپ کا کلام ظہیر سے صرف بہتر ہی نہیں ہے بلکہ (بقول صاحب شعر العجم) ظہیر کے کلام کو آپ کے کلام سے کچھ نسبت نہیں۔"

حضرت نظامی پیغمبران سخن میں ہیں حافظ کی نظم عموماً اُن سے پست ہی لیکن کہیں کہیں نظامی سے بڑھ بھی جاتے ہیں آپ الضافاً نظامیؒ سے اپنے اسی قدر مقابلے پر اکتفا فرماتے ہیں کہتے ہیں ؎

چو سلک دُرِّ خوشاب است نظم تو حافظ　　　که گاه لطف سبق می برد ز نظم نظامی

حضرت امیر خسرو دہلویؒ کے آپ تھوڑے ہی عرصہ بعد مشہور ہوئے ہیں آپ نے بچپن میں حضرت امیر خسرو کا زمانہ پایا ہے اور ایران میں آپ کی شاعری شروع ہونے کے قریب ہی حضرت امیر خسروؒ نے ہندوستان میں انتقال فرمایا ہے گویا بلبل شیراز انتظار ہی میں تھا کہ طوطیٔ ہند خاموش ہولے تو میں اپنی زبان کھولوں!

خسرو علیہ الرحمہ کے کمال شیرینی اور فصاحت کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہوگا کہ ظہیر و نظامی تک سے حضرت خواجہ حافظؒ نے اپنے کلام کو فائق بتایا ہے خلاف ازیں حضرت امیر خسرو کی شیرینی کے اپنے کلام میں بار بار معترف ہوئے ہیں فرماتے ہیں ؎

اگرچہ ہست شیریں شعر حافظ　　　چو لعل خسرو خوباں نہ باشد

اس مقطع میں خواہ مخاطب کوئی اور ہی رہا ہو مگر حضرت امیر خسروؒ کی شیریں سخنی کی تلمیح سے یہ شعر خالی نہیں ایک اور شعر میں حضرت امیر خسرو علیہ الرحمہ کے اپنے پیر روشن ضمیر حضرت خواجہ نظام الدین اولیا قدس سرہ کے لعاب دہن سے نعمت شیرینی حاصل کرنے کی تا حال مشہور روایت کی جانب حسرت سے اشارہ فرماتے ہیں:۔

نہ گفتے کس بہ شیرینی چو حافظ شعر در عالم — اگر طوطی طبعش را ز لعل او شکر بودے!

سلطان غیاث الدین سلطان بنگالہ کو ایک فرمائشی غزل ارسال کی ہے اِس کی بھی ایک شعر سے حضرت امیر خسروؒ کی شیریں سخنی کا اعترافی اشارہ پیدا ہے ؎

شکر دہن شوند ہمہ طوطیان ہند — زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

حضرت کی یہ دعا یا پیشین گوئی جو کچھ بھی پوری ہوئی ہندوستان میں فارسی کے نامی شاعر ہوئے فیضی، قتیل، بیدل، خان آرزو، واقف، غنی وغیرہ مسلمانوں میں گذرے جن کے کلام کی اہلِ زبان نے بھی داد دی اور شکر دہنی اُن کی مسلّم ہوئی آخر میں ایک شکر دہن بھی پیدا ہوئے جو اپنے اِس ہندی نہ فارسی شعر سے شناخت ہوں گے ؎

کاؤ کاؤ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ — صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

ان کے دہن میں قند پارسی جم کر سخت ثقل ہو گیا تھا

حضرت امیر خسرو کی شیرینی سخن کا اعتراف محض عقیدت و انکسار پر مبنی نہیں معلوم ہوتا بلکہ کلام سے ثبوت ملتا ہے کہ حضرت امیر خسروؒ کی بعض مشہور طرحوں پر غزل لکھنے کی آپ نے کوشش فرمائی تاہم اگرچہ سعدی، ظہیر، خواجو سلمان وغیرہ کی غزلوں پر اُن ہی بحروں میں قافیہ بقافیہ غزل لکھنے میں حضرت کامیاب ہوئے ہیں۔ لیکن حضرت امیر خسرو کے بحر و قافیہ کو بدل کر بھی اُس رنگ مرتبہ کی غزل لکھنے میں حضرت کو کامیابی نہیں ہوئی مثلاً حضرت امیر خسرو کی غزل ہے ؎

گفتم کہ روشن از قمر گفتا کہ رخسار من است — گفتم کہ شیریں از شکر گفتا کہ گفتار من است

حافظ صاحب نے بھی اِسی انداز میں گفتم گفتا کی مشق ایک سے زیادہ غزلوں میں

فرمائی ہے چنانچہ ایک غزل کا مطلع ہے ؎

گفتم غم تو دارم گفتا غمت سر آید ۔ گفتم کہ ماہ من شو گفتا اگر بر آید

مطلع کو مطلع سے یہاں، اور باقی اشعار کو دیوان میں باقی غزل سے مقابلہ کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ حافظ صاحب امیر خسرو کو نہیں چھو سکے۔

حضرت امیر خسروؒ کی ایک دوسری مقبول غزل کا مطلع ہے ؎

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست ۔ ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست

جواب حافظ صاحب کی یہ غزل سمجھی جا سکتی ہے ؎

عاشق جاناں مرا با کفر و با ایماں چہ کار ۔ تشنۂ دردم مرا با وصل و با ہجراں چہ کار

مطلعوں ہی کے مقابلہ سے حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کے مطلع کی فوقیت مذاق صحیح اور طبع سلیم پر روشن ہوگی بعض تو ان غزلوں کو جو حضرت امیر خسروؒ کے مقابلے میں آتی ہیں اس قدر گھٹیا پاتے ہیں کہ ان کو حافظ کا کلام ہی نہیں سمجھتے مگر حضرت کی وفات کے قریب ہی جو نسخۂ دیوان خاص شیراز میں تحریر ہوا ہے اور آصفیہ کتب خانے میں موجود ہے، اس تک میں تو ان غزلوں کو ہم موجود پاتے ہیں۔
خسرو کی دیگر مشہور غزلوں پر حضرت حافظؒ نے بہ تبدیل بحر و قافیہ بھی غزل لکھنے اور قلم اٹھانے کی جرأت نہیں فرمائی ہے علی الخصوص ذیل کی غزلوں پر جن کے مصرع اول یہ ہیں :-

؎ اے چہرۂ زیبائے تو رشک بتان آذری

(") خبرم رسید امشب کہ نگار خواہی آمد

(") نمی‌دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم

؎ بخوبی ہمچو مہ تابندہ باشی" وغیرہ وغیرہ

حافظ صاحب کے دیوان میں ان کی طرز پر کوئی غزل نہیں گو بجائے خود بہت سا عمدہ اور بے مثل کلام موجود ہے حضرت امیر خسروؒ کے اعتراف کے صلہ میں مبدٔ فیاض نے حافظ صاحب کو شیرینی بھی عطا فرمائی اور اس پر ایک مستی خاص اضافہ کی جو اسی طرح جیسے شیرینی حضرت امیر خسروؒ کی خاص صفت ہے حافظ صاحب کا خاص وصف قرار پائی جس سے کوئی نہ بڑھ سکا اسی طرح جیسے شیرینی میں کوئی خسروؒ سے آگے نہ نکل سکا!

فی الجملہ آپ کا کلام لطیف و دلکش موثر و حسین ہوتا ہے۔ دل میں گھر بناتا ہے ترتیب الفاظ میں موسیقی سناتا ہے، حافظے پر زور نہیں پڑتا، سن کر یاد رہجاتا ہے۔ صنائع لفظی و معنوی سے آراستہ اور ڈھلا ہوا گویا آسمان طبیعت سے نازل ہوتا ہے، صنائع اسپر بار نہیں معلوم ہوتے نہ اُن کے معانی کا پہلو دبنے پاتا ہے بلکہ رنگ برنگ لطف در لطف دکھاتا ہے آسانی اور روانی سے گمان نہیں ہوتا کہ اس کے موزوں کرنے میں شاعر کو کچھ کاوش ہوئی، معانی ضرور بالضرور کسی نکتہ نادر یا ظرافت کو لئے ہوتے ہیں۔ جو اشعار اوپر مثالوں میں گذرے سب ان دعاوی کی دلیل ہیں صرف ایک مصرعے کے صنائع لفظی و معنوی کا حسن یہاں مثالاً آشکارا کرتے ہیں مصرعہ یہ ہے ؎

ماہم این ہفتہ شد از شہر و بچشمم سالیست

اس ایک مصرعے میں جنتری کی چار اصطلاحات ماہ، ہفتہ، شہر، سال بے تکلف جمع ہوگئی ہیں جلدی جلدی جھپٹ کر پڑھنے میں ایک روانی بھی ہے جس پر غالب کے اس مصرعے کے ؎

واں تو میرے نالے کو بھی اعتبار نغمہ ہے" مدّاح وٹ ہیں مصرعہ حافظ کی روانی میں لُطف بلند وپست بھی ہے نے چشم پر رک کر پھر اُٹھتا اور سا پر چڑھ کر بیست پر اُترتا اور بحر میں غائب ہو جاتا ہے۔ ہم ہفتہ اور شہر کی ہ بارہ بار اور رشد شہر و چشم کے شین کی تکرار ماہم ایں اور چشم سا کی آواز وں کا مصرعہ کے اوّل و آخر میں جواب وسوال یا اُلٹ پھیر مصرعے کے حُسن کے دیگر اجزا و اسباب ہیں۔ رک کر پڑھنے میں ماہم ایں سے چشم سا تک مصرعہ موسیقی کے ٹھیکوں (تا دِھن دھیں (دِرِک دِھن تا) پر پورا اُترا ہوا اور الفاظ بجتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان سب خوبیوں کا شمار صنائع میں ہے تاہم ان محاسن لفظی اور ترکیبی نے معانی کا پہلو کسی طور پر دبنے یا زخمی ہونے نہیں دیا ہے بجائے خود صحیح وسالم موجود اور بجوبی تمام روشن ہیں اور کیسی سچی حقیقت واقعہ کا اظہار کر رہے ہیں جس سے انکار محال ہے۔ یعنی ہر عزیز از جان کی جدائی کا ایک ہفتہ ایک مدت دراز نظر آتا ہے۔ کسی منطقی کو اگر اسپر اعتراض ہو تو دوسرے مصرعے میں اُس کو اِس طرح خاموش کیا گیا ہے ؎

حالِ ہجراں تو چہ دانی کہ چہ مشکل حالیست ؟

یعنی جس پر گذرتی ہے وہی خوب جانتا ہے۔ چشم سالیست کا ایک معنوی لطف یہ بھی ہے کہ سال فارسی میں رودخانہ (جھرنا) کو بھی کہتے ہیں اور چشم سالیست کے معنی یہ بھی ہیں کہ مری آنکھ رودخانہ بنی ہوئی ہے جس میں پانی جاری رہتا ہے۔

کوئی لفظ حضرت کے شعر میں بے کار بے مصرف بھرتی کا یا ضرورت سے کم و بیش وزن مرتبہ و غیر مناسب نہیں ہوتا اپنی جگہ پر موزوں بلکہ ناگزیر ہوتا ہے سب الفاظ مل کر معانی کا حُسن بڑھاتے اور بے مثل ترتیب کے ساتھ منسلک ہوتے ہیں۔ کوئی اور مثال دینے کی ضرورت نہیں یہ سب خوبیاں اِسی شعر میں موجود ہیں کوئی

لفظ کم یا بیش یا پس و پیش بتانا محال ہے اب غالب کے پورے شعر کو دیکھئے ۔

ہم نشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست　　واں تو میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

دونوں مصرعوں کے الفاظ ایسی کسی صنعت سے مبّرا ہیں جیسی کہ حافظ کے مصرعے میں چار اصطلاحات ہم جنس کے بے تکلف جمع ہو جانے اور رسال کے ذو معنی ہونے سے پیدا ہے۔ دویم یہ کہ کوئی حقیقت حال جیسی کہ اشد انتظار میں دن پہاڑ ہو جانے یا مفارقت عزیز میں آنسو جاری رہنے کی، حافظ صاحب کے شعر میں مع دلیل کے موجود ہے غالب کے شعر میں قطعاً بیان نہیں ہوئی۔ بلکہ انتہا درجہ ناگوار مبالغہ سے کام لے کر دوست کو بیرحم قصاب و جلاد سے بھی زیادہ سنگدل دکھایا ہے کہ وہ نالے کو نغمہ سمجھتا ہے۔ اِس کی کوئی وجہ بیان نہیں ہوئی ہے کہ دوست ایسا سنگدل کیوں ہے، دشمن سے یہ سنگدلی منسوب کرنا زیادہ زیبا تھا اور یہ شعر عیوب اور مبالغے سے بچاکر کچھ اس طرح اور بہتر بلکہ مطلع بنا کر بھی کہا جا سکتا تھا ۔

زاریِ مرغِ قفس جوں در شمارِ نغمہ ہے　　یہاں تو میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

ہمارا ادعا غالب کو اصلاح دینا نہیں ہے صرف یہ دکھانا ہے کہ بہتر سے بہتر شاعر سے بھی حافظ صاحب کس قدر بلند تر ہیں اُن کے مطلع میں ہرگز کسی حرف کو کم و بیش کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ غالب کا پہلا مصرعہ باوجود قافیے کی قید سے آزاد ہونے کے ڈھلا ہوا نہیں ہے ترقی کی گنجائش صاف طور پر موجود ہے اور کاف کی تکرار نے اُس میں ٹھوکریں تو زبان کے لئے اتنی پیدا کر دی ہیں جن کی تلافی میں مصرعۂ ثانی کی روانی تمام صرف ہو جاتی ہے۔

غالب کے ہاں صرف یہ ایک شعر مولوی حالی نے اس صنعت کا بتایا ہے

جس میں بیک وقت دو معنی پیدا ہیں ؎

لبِ ساقی پہ مکرر ہے صلا میرے بعد ۔ کون ہوتا ہے حریفِ مےِ مرد افگنِ عشق

حافظ کے ہاں قدم قدم پر ایسے اشعار ملتے ہیں کہ انھیں ایک الفاظ میں شعر چند معنی پر دلالت کرتا ہے ایک معنی لطیفہ سناتے ہیں دوسرے کوئی نصیحت یاد دلاتے ہیں تیسرے کوئی اور مزہ چکھاتے ہیں مثلاً ؎

صوفی ار بادہ باندازہ خورد نوشش باد ۔ ورنہ اندیشۂ ایں کار فراموشش باد

(۱) ایک پھڑکتا ہوا لطیفہ ہے کہ صوفی صاحب - جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اوّل تو پیتے ہی نہ تھے اب جو پینے پر آ ندے تو ایسے کہ اوروں کے لیے بچنی دشوار ہو گئی یارو دعا کرنی پڑی کہ :- اگر انداز و اعتدال سے پئیں تو بار الٰہا رچا پچا ہو ورنہ بادہ نوشی کا خیال ہی اُن کے دل سے بُھلا دیجو !

(۲) ایک عام نصیحت ہے کہ انداز سے اور اعتدال کے ساتھ ہر کام اچھا ہوتا ہے اور راس آتا ہے بے طور و بے قاعدہ کام ہونے سے نہ ہونا بہتر ہے -

۳ - ایک خاص نصیحت طالبانِ معرفت کو ہے جس کی تعلیم کے اصول اور ریاضت کے انداز سے مقرر ہیں اُن کی تعمیل ضروری ہے ورنہ بتجربہ نقصان ہوتے ہیں اور اوراد و اشغال کی کثرت و بے اعتدالی سے لوگ پاگل ہو جاتے ہیں ؎

ساقی مگر وظیفۂ حافظ زیادہ داد ۔ کآشفتہ گشت طرۂ دستار مولوی

(۱) لطیفہ ہے کہ حافظ کی تنخواہ (بجائے نقد کے) ساقی نے شاید جنس میں ادا کر دی اور کس جنس میں؟ کہ شراب کی صورت میں یہی وجہ ہے کہ حضرت کی دستار مولویانہ آج آشفتہ نظر آ رہی ہے یعنی حضرت پی گئے دستار لٹ پٹی اس کی گواہی دے رہی ہے

(۲) شراب کی ناپاک صورت میں اہل شرع کے حقوق ادا ہوتے ہوئے دیکھ کر مولوی نے غیرت دینی سے بُغضاً للّٰہ بُرا مانا

(۳) زیادہ اور زیادہ میں تجنیس خطی ہے یعنی زیادہ کو زیادہ پڑھ سکتے ہیں پس معنی یہ ہوئے کہ حافظ کو وظیفے کی رقم مولوی سے زیادہ مل گئی اس پر مولوی بگڑ گیا کہ عالم کا مرتبہ حافظ سے بہرحال زیادہ ہے حافظ کو اس پر فوقیت نہ ہونی چاہیئے۔

(۴) حافظ کی تنخواہ بادہ کی صورت میں ادا ہوئی دیکھ کر مولوی نے ناک بھوں چڑھائی کہ مجھے کیوں اس نعمت سے محروم رکھا گیا!

(۵) بادشاہ وقت پر (جس نے شراب کی فروخت و استعمال پر سے افزائش محاصل کے لیئے اکثر بندشیں اٹھا دی تھیں) زبردست طعن ہے کہ خزانے میں مال حرام جمع ہوتا ہے مصارف خیر میں ایسا روپیہ کیا خاک موجب ثواب ہو سکتا ہے!!

(۶) ارباب دین کو آگاہی ہے کہ وہ جو اس خزانے سے تنخواہ پاتے ہیں لقمہ مشتبہ کھاتے ہیں۔

(۷) نوبت شرابخواری تا بہ اینجا رسید کہ حافظ و مولوی تک بادہ خواری کرتے ہیں اور کمی بیشی پر ساقی سے لڑتے ہیں!

(۸) ساقی نے حافظ کو وظیفے (مقدار مقرری) سے زیادہ دیدی جبھی آج حضرت کی دستار لٹ پٹی ہو رہی ہے!

غرض اتنے گوناگوں معنی ان دو مصرعوں کے شعر سے مستنبط اور مستفاد ہوتے ہیں!

حافظ آراستہ کن بزم و بگو واعظ را   کہ ببیں مجلسم و ترک سر منبر گیر

اس شعر میں ترک کو ترک بھی پڑھ سکتے ہیں اور ترک کے بھی دو معنی لے سکتے ہیں!

ترک کرنا یا چھوڑنا اور آزاد فقیروں کی قلندری ٹوپی۔ ان سب معانی کے لحاظ سے شعر کا گوناگوں مطلب یہ ہے:۔

حافظ اپنی محفل سجا کر واعظ کو دکھا کہ دیکھ محفل اسے کہتے ہیں آئندہ سے (۱) منبر پر چڑھ کر وعظ کہنا چھوڑ دے (۲) تو بھی ایسی ہی مجلس سجایا کر!

(۳) تو بھی عمامے کی جگہ (ترک) قلندری ٹوپی بر سر منبر پہنا کر

(۴) میرا مُرید و قلندر ہو جا!

(۵) تو بھی ایک (تُرک) امرد حسین، کو سر منبر بغل میں لے کر بیٹھا کر!

اعتمادے بنما و بگذر بہر خدا   تا نہ بینی کہ دریں خرقہ چہ نادرویشم

حُسن ظن سے کام لے کر برائے خدا میرے دیکھنے کو نہ ٹھیر آگے بڑھ راستہ لے اپنا تاکہ۔ مبادا کہیں تیری نظر پڑ جائے اور تو دیکھ پائے کہ (۱) اس درویشانہ لباس میں حقیقی درویشی سے میں کس قدر بر عکس (نادرویش) ہوں یعنی کیسا دنیا دار بد اعمال ہوں (۲) اس قلندری لباس میں میں کیسا نادر درویش، لاجواب طبقہ کا آدمی ہوں، ہیرا آدمی ہوں

عشوہ از لب شیرین تو دل خواست بجاں   بشکر خندہ لبت گفت مزادے طلبیم

(نکتہ:۔ مزادے کو (بے نقط) مُرادے بوجہ صنعت تجنیس پڑھ سکتے ہیں، اور مزادہ کے معنی توشہ دان اور جنگ کے بھی ہیں)

(۱) دل نے جان قیمت میں نذر کر کے ایک عشوہ شیریں کی لب معشوق سے درخواست کی بالفاظ دیگر چاہا کہ کوئی مزید اِرلطیفہ ارشاد فرمائیں جس پر جان قرباں ہو جائے ہونٹوں نے شکر خندہ یعنی میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا (۱) جان کافی نہیں ہے ہم تو کچھ اور زیادہ چاہتے ہیں،

(۲) دل نے جان کی امان مانگ کر ایک عشوے کی درخواست کی تو ہونٹوں نے جواب دیا کہ ایک مراد مانگو یعنی جان کی امان مانگ لو یا عشوۂ شیریں ہی طلب کرو۔ بیک وقت دو سوال نہ کرو"

(۳) عشوۂ شیریں کی درخواست پر کھل کھلا دیا شکر برسا دی اور کہا کہ منگا لو اپنا توشدان بھر لو شکر جتنی چاہیئے

(۴) عشوۂ شیریں کی درخواست پہ ہونٹوں نے ہنس کر جواب دیا کہ ہم تو جیک چاہتے ہیں

(۵) عشوۂ شیریں کی خواہش تمام طلب کی تو مطلب سعدی سمجھ کر ہنس پڑے اور کہا کہ اچھا مراد اپنی کہو کہ کیا چاہتے ہو؟

(۶) جان پیش کر کے ایک عشوۂ شیریں طلب کیا تو ہنس کر فرمایا کچھ زیادہ مانگو

خلاصہ یہ کہ ایک لطیفے اور نکتہ نغز کے جواب میں ہونٹوں نے اتنے پھول جھاڑ دئے! ؎

الا اے پیر فرزانہ مکن منعم ز مے خانہ — کہ من در ترک پیمانہ دل پیماں شکن دارم

(۱) اے فراست کے پتلے بڈھے پیر مجھے مے خانہ جانے سے منع نہ کر کہ (۱) ترک شراب کے معاملے میں قدرت نے مجھے پیماں شکن دل دیا ہے یعنی شراب کی توبہ میری سلامت نہیں رہتی پس مجھ کو منع کرنا بے حاصل ہے

(۲) مجھے نہ روک کہ پیمانہ (پیمان کا مصغر) کیا، میں تو پیماں (بڑا پیمانہ) توڑنے کی نیت رکھتا ہوں۔

(۳) ترک پیمانہ (شراب) کے بارے میں مجھ پہ بندشیں ہوئیں تو میں اس مزاج کا آدمی ہوں کہیں عہد ایمان) نہ توڑ ڈالوں اور اسلام ہی سے نکل جاؤں:

(۴) یہ دل تو وہ ہے جس نے عہد شراب تو کیا چیز ہے پیمان ازل تک کو توڑ ڈالا ہے

یعنی میں ازلی پیماں شکن ہوں"

(۵) سینکڑوں عہد شکنیاں وعدہ خلافیاں کرتا رہتا ہوں تو بہ شکنی از انجملہ صرف ایک چیز ہے

سخن درست بگویم نمی توانم دید — کہ می خورند حریفان ومن نظارہ کنم

سچی بات تو یہ ہے کہ یہ نہیں برداشت ہو سکتا کہ یار شراب پئیں اور (۱) ہم دور سے کھڑے دیکھا کریں شریک نہ کیے جائیں!

(۲) یاروں کو اس معصیت سے ہم منع نہ کریں کھڑے دیکھا کریں!

منم کہ شہرہ شہرم بعشق ورزیدن — منم کہ دیدہ نیالودہ ام بہ بد دیدن

(۱) وہ میں ہی ہوں کہ جس نے کسی پر بری نظر کرنے سے اپنی نگاہ کو کبھی ناپاک نہیں کیا۔

(۲) وہ میں ہی ہوں کہ جس نے کبھی کسی بری صورت پر نظر ڈالنے سے آنکھوں کو آلودہ نہیں کیا ہمیشہ حسن کو تاکتا اور حسینوں ہی کو گھورتا رہا ہے۔

فریب دختر رز طرفہ می زند رہ عقل — مبادتا بہ قیامت خراب طارم تاک!

اس شعر کے مصرعۂ دوم میں خراب کی ب کو با اضافت و بے اضافت دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں۔

صورت اول میں معنی یہ ہوں گے کہ:۔ شراب انگوری عجیب رنگ دکھاتی ہے کہ عقل دنگ ہوتی ہے پس دعا ہے کہ الہی انگور کی بیل تا قیامت خزاں نہ دیکھے!

صورت دوم میں (با اضافہ) معنی یہ ہوں گے کہ:۔ انگور کی شراب کا چھنال رنگ بے طرح حواسوں کے ساتھ دشمنی کرتا ہے الہی تا قیام قیامت کسی کا دل انگور کی شراب تو شراب اس کی ٹٹی کا بھی شکار نہ ہو بیل کے پیچ در پیچ دام میں نہ الجھے!

نصیب ماست بہشت ای خداشناس برو   کہ مستحق کرامت گناہگارانند

(۱) خداشناس کو جھڑکتے ہیں کہ نکل جنت سے! تو اس میں کہاں گھس آیا اس کے مستحق تو گنہگار ہیں۔"

(۲) "ما" کے حکم میں مخاطب حاضر بھی (جو خداشناسی کی وجہ سے بیم و رجا میں ہے) شامل ہو سکتا ہے اور "برو" سے اشارہ "داخل ہو" کا بھی کرتے ہیں۔ اور "جا مطمئن ہو کر بیٹھ" کے معنی بھی لئے جا سکتے ہیں بہرحال خدا سے خائف و ترساں کو بھی تسلی دی گئی ہے کہ جنت اپن کے ہی لئے ہے گنہگار ہیں تو دُگدا کیا ہے ضرور بخشے جائیں گے!

زلفش کشید باد صبا چرخ سفلہ بیں   مارا مجال باد و زانم نمید ہد

بادِ صبا اُس کی زلفیں گھسیٹ رہی ہے اور چرخ نا ہنجار کمینہ کو دیکھو کہ ہمیں اتنی بھی قدرت نہیں کہ :- (۱) باد صبا کو وہاں سے مار کر نکال سکیں (۲) پنکھا جھلنے ہی کی خدمت بجا لائیں پنکھا قُلی بنیں (۳) دم مار سکیں سانس لے سکیں وغیرہ

ایک خاص کمال حضرت کا یہ ہے کہ نہ صرف اصطلاحات سکیشی میں نفیس نفیس اشعار لکھ سکتے ہیں بلکہ جس صیغے کی اصطلاحات سے چاہتے ہیں بے تکلف یہی کام لے لیتے ہیں اس حُسن کے ساتھ کہ تلازمات کی بوقلمونی میں نفسِ مضمون ہرگز پامال نہیں ہونے پاتا:-

اصطلاحاتِ منطق و فلسفہ میں ادائے مضمون کی مثال ؎

ساقیا در گردشِ ساغر تعلل تابچند   دور چوں باعاشقاں افتد تسلسل بایدش

بعد از نیم نہ بود شائبہ درجوہر فرد   کہ دہانِ تو درین نکتہ خوش استدلالیست

اصطلاحاتِ موسیقی میں ادائے خیال :-

ایں مطرب از کجاست کہ ساز عراق ساخت   و آہنگ باز گشت ز راہِ حجاز کرد؟

اصطلاحات بہار کا گلدستہ :۔

بُتے دارم کہ گرد گل ز سنبل سائبان دارد
بہار عارضش خطے بخون ارغوان دارد

اصطلاحات شیرینی کا مزہ :۔

اے پستہ تو خندہ زدہ بر دہان قند
مشتاقم از برائے خدا یک شکر بخند

اصطلاحات درس و تدریس :۔

بخواہ دفتر اشعار و راہ صحرا کن
چہ وقت مدرسہ و درس کشف و کشاف است

اصطلاحات عکس و نور :۔

اے کہ بر مہ از خط مشکین نقاب انداختی
لطف کردی سایۂ بر آفتاب انداختی

اصطلاحات چشم :۔

جمال دختر رز نور چشم و عین ماست
کہ در نقاب زجاجی و پردۂ عنبی است

اصطلاحات نجوم کا نمونہ :۔

گفتم کہ ابتدا کنم از بوسہ گفت نے
بگزار تا کہ ماہ ز عقرب بدر شود

اکثر آپ کا طرز ادا بانکا اور ایک شباب کا عالم رکھتا ہے خشکی اور عبوست سعدی کے اس مشہور شعر کی سی نہیں ہوتی ؎

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

شعر لاجواب ہے مضمون نایاب اور خداداد لیکن ایک خیال مجرد ہے جیسا کان سے بر آمد ہوا ویسا ہی انگھڑ موزوں کر دیا گیا ہے نہ بحر پھڑکتی ہوئی، نہ قافیہ دلکش نہ ردیف بجتی ہوئی عجب ادا سے اور اوچھا سا عالم اس شعر کا ہے ایک لفظ سبز نے کچھ طراوت بخشی تھی مگر اُس پر اعتراض ہے کہ سبز کی قید کیوں ہے کیا برگ زرد اور برگ سرخ دفتر

معرفت کے ورق نہیں ہیں؟ تاہم مضمون عالی اور شعر بہت بلند ہے شعرا اس تک رسائی کے لئے طبع آزمائی کرتے رہے ہیں ابو الفضل کا بھی اس کی حرص میں کہا ہوا شعر موجود اور اسپر قدردانی عالم بالا بھی حکایتوں میں مشہور ہے ؎

ہر گیاہے کہ از زمیں روید　　وحدہٗ لا الٰہ می گوید (ابو الفضل)

ابو الفضل کے بھی شعر میں ہُو کا عالم ہے کوئی دلچسپی اور ترنم نہیں۔

حضرت حافظ نے بھی سعدی کے ہم پلہ مضمون لانے کی فکر اپنے ایک شعر میں مائی ہے مگر اس طرح کہ ایک بہار و گلزار اس کے ساتھ دکھایا ہے کہ دگار عالم کی ہی نہیں اہل عالم اور کردگار عالم سب کی طرف توجہ دلائی ہے۔ سعدی اور علامی نے کوئی سبز عبرت آموز عائد نہیں کیا ہے حافظ صاحب کا شعر سبق آموز عبرت انگیز اور نتیجہ خیز مع ہذا ایک نفیس بحر و قافیہ میں ادا ہوا ہے کہ بے ساز و آواز الفاظ میں ہی ترنم پیدا ہے۔ فرماتے ہیں :- ؎

در چمن ہر ورقے دفتر حال دگر ست　　حیف باشد کہ ز حال ہمہ غافل باشی

متصوفانہ کلام آپ کا تعریف سے اور بھی بالاتر ہے اس کے معانی کا سرور حدِ کیف سے بڑھا ہوا ہے اہل دل اس کو سُن کر تا دیر ہوش میں نہیں آتے اگرچہ ابتدائی کلام ہے لیکن اس سے بڑھکر اور کیا مثال ہوسکتی ہے :- ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق　　ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

ما در پیالہ عکس رُخ یار دیدہ ایم　　اے بیخبر ز لذت شرب مدام ما

ان تمام محاسن اور خصوصیات کی بنا پر حافظ صاحب کا کلام صوفیہ کی محافل وجد و سماع میں بادشاہوں کی عشرت گاہوں میں امرا کی محفلوں میں ادبی مجالس و

ومکاتب اور علمار کے مطالعہ میں، عوام کے جلسوں اور رقص وسرود میں، کئی صدی سے ہر دلعزیز و دل پسند چلا آتا ہے اور دف و چنگ و نے وغیرہ بین باجوں کی دلفریب مگر لایعنی آوازوں کو معنی خیز اور عبرت انگیز و سبق آموز بناتا رہا ہے کثرت استعمال سے دلوں پر نقش تو زباتوں پر از بر ہو کر تحریرات و کاروبار و گفتگو میں اُس کے لطائف تراوش کرتے ہیں اور مدعاؤں کی تائید میں اُس سے دلائل لائے جاتے ہیں بہت سے اشعار اور مصرعے ضرب المثل ہیں ناخواندوں تک کی زبان سے سُنے جاتے ہیں اور کُل دیوان من حیث المجموع اس قدر عزیز و مقدس مانا جاتا ہے کہ لوگ سر آنکھوں پر رکھتے اُس سے فالیں دیکھتے اور حسب مراد پانے پر مٹھائیوں میں تولتے ہیں!

عربی، ترکی، فرانسیسی، انگریزی، ایطالی، روسی، جرمنی وغیرہ زبانوں میں ترجمے موجود ہیں اور بزرگ صاحب دیوان کے حالات کی بڑی تلاش و جستجو ہے ایک فرنگی مستشرق کا مقولہ ہے کہ حافظ اور خیام کے حالات اس قدر کم معلوم ہیں کہ اُن میں کوئی ایک سطر بھی اضافہ کردے تو بڑا احسان کرے۔

افسوس ہے کہ ایسے صاحب کمال کے حالات وسوانح زندگی تاریخوں اور تذکروں کے ذریعے بہت ہی کم پہونچے ہیں۔ سب سے زیادہ معرض بحث میں اور معرکۃ الآرا سوال خود حضرت کی سیرت کی بابت ہے کہ آپ رند تھے یا صوفی؟ خراباتی کہ خانقاہی، عاشق مجازی یا عاشق الٰہی، میخوار کہ پرہیزگار؟ نظر باز کہ صرف ناظر حسن؟ لیکن یہ سوال نیا نہیں حضرت کی حیات کے زمانے سے آج تک نہایت دلچسپ و دلفریب چلا آتا ہے اور ہر ایک کے اندازۂ تحقیق اور معیار حُسن ظن یا سوء ظن کے مطابق طے ہوتا رہا ہے اور طے ہوتا رہتا ہے بعض دلیر

حضرات بفحوائے " المرء یقیس علیٰ نفسہ" اِس سوال کو اپنے ہی نفس کے اندازے پر طے کر ڈالتے ہیں!

کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال خاص آپ سے براہ راست بھی لوگ کر بیٹھتے تھے آپ اُس کا جواب دیتے ہیں اِس مطلع میں ؎

درنظر بازی ما بیخبراں حیرانند　　　من چنانم کہ نمایم دگر ایشاں دانند

یعنی میری رندی اور اوباشی کے بارے میں ناواقف لوگ حیران ہیں۔ لیکن میں جیسا نظر آتا ہوں ویسا ہی باطن میں بھی ہوں۔ باقی (سوءظن کی) باتیں۔ وہ (الزام لگانے والے) اُن سے واقف (آشنا ہوں گے میں آشنا نہیں) اس کو اِس طرح فرمایا ہے کہ مترادف ہو اِس کہنے کا کہ باقی کی تفصیل فضول ہے اِس لئے کہ وہ جانتے ہی نہیں! ایسی کہہ کرنی سے جن کی تشفی نہ ہو سکتی تھی وہ براہ راست آپ کے دیکھنے کو پہونچ جاتے تھے اور عین الیقین حاصل کرنا چاہتے تھے آپ اُن سے بمنّتِ تمام کہتے ہیں کہ یارو سوءظن نہ کرو حسن ظن سے کام لو۔ ؎

اعتمادے بنما و بگذر بہرِ خدا　　　تا نہ بینی کہ دریں خرقہ چہ نادرویشم

اس شعر کی شرح اوپر گذر چکی ہے خلاصہ یہ ہے کہ حضرت نے اپنے آپ کو اِس شعر میں نادرویش (بفتح دال) اور نادِرویش (بالکسر) دونوں کہا ہے ایک صورت میں "درویشوں کے برعکس" اور دوسرے میں لاجواب خصلت کا شخص" مراد ہے اور حقیقی بات کو پھر معمّا بنا دیا ہے، صاف و صحیح بات بھی کہہ جاتے ہیں مگر اس طرح جھلا اور جھنجھلا کر کہ گمان ہوتا ہے کہ غصّے میں کہدیا ہے مگر غصّے کی بات کا کیا اعتبار۔ اس لئے پھر بھی شک رہ جاتا ہے، فرماتے ہیں۔ ؎

من اگر رندم و گر شیخ چہ کارم باکس حافظِ رازِ خود و عارفِ وقتِ خویشم

یہ سب سوءِ ظن آپ کے حاسدوں کی گفتار اور آپ کی غزلوں کے رندانہ اشعار سے پیدا ہوتا تھا۔ آپ ہی کے اشعار سے آپ پر رندی تھوپی جاتی تھی آپ اِس بدذاقی پر کہ اشعار سے استدلال شاعر کی رندی پر کیا جائے کبھی تو سخت منغض ہوتے تھے جیسا کہ اِس شعر میں اپنا یا معترض کا سر پھوڑ دینے پر آمادہ معلوم ہوتے ہیں۔ ؎

سرِ تسلیمِ من و خاکِ درِ میکدہ ہا مدعی گر نکند فہمِ سخن، گو سر و خشت!

من اگر رندم و گر زاہد تو براہِ خود باش کہ ہر آنکس دِرَوَد عاقبت کار کہ کشت

اور کبھی آزردہ ہو کر اپنے واقفِ رازِ مسلّمہ زہد و اتقا کے لوگوں کو گواہِ عصمت بناتے تھے جیسے کہ اِس شعر میں حضرت امین الدین حسنؒ (اُس عہد کے ایک بڑے متقی بزرگ) کی دُہائی دی ہے فرماتے ہیں۔ ؎

برندی شہرہ شد حافظ بس چندیں ورع اما چہ غم دارم کہ در عالم امین الدین حسن دارم

کبھی اُس معشوق کی جس کا عشق آپ پر تھوپا جاتا تھا مسلّمہ پاکدامانی کو گواہ لا کر اپنی برأت الزام ثابت کرتے تھے ؎

من گر آلودہ دامنم چہ عجب ہر دو عالم گواہِ عصمتِ اوست

کبھی جل بھُن کر اقرارِ رندی و نظربازی وغیرہ تمام الزامات کا کر لیتے تھے اِس طرح کہ یاروں کو بھی خفت آجائے۔ ؎

من ارچہ عاشق ام و رند و مست و نامہ سیاہ ہزار شکر کہ یارانِ شہر بے گنہ اند!

منم کہ شہرۂ شہرم بعشق ورزیدن منم کہ دیدہ نیالودہ ام بہ بد دیدن

کبھی آپ اِن اتہامات کے مزے لیتے تھے اور مذاق اُڑاتے تھے یا الزام کو اور

زیادہ منڈھ کر اپنے اوپر اوڑھ لیتے تھے۔ ؎

دی عزیزے گفت حافظ می خورد پنہاں شراب
اے عزیز من گنہ آن بہ کہ پنہانی بود!

عجب می داشتم دیشب ز حافظ جام و پیمانہ
مگر منعش نمی کردم کہ صوفی وار می آورد

حدیث حافظ و ساغر کشیدن پنہاں
چہ جائے محتسب و شحنہ پادشہ دانست

ان اشعار سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کھلم کھلا شرابخواری کا الزام اُن پر اُن کے ہمعصر دشمنوں کی طرف سے بھی نہ تھا۔

کبھی آپ اپنے متہم کرنے والوں پر پلٹ بھی پڑتے تھے اور ایسے لتے لیتے کہ اُلٹا چور بنا کر چھوڑتے فرماتے ہیں ؎

ریا حلال شمارند و جام بادہ حرام
زہے طریقت و ملت زہے شریعت و کیش

بادہ نوشے کہ درو ہیچ ریائے نبود
بہتر از زہد فروشے کہ درو زور و ریاست

رندی آموز و کرم کن کہ نہ چندیں ہنر است
حیوانے کہ ننوشد مے و انساں نشود

کبھی موچھوں پرتاؤ دے کر اپنی رندانہ حالت کا فوٹو گراف دکھاتے ہیں اور چیلنج دیتے ہیں۔ ؎

گل در بر و مے در کف و معشوقہ بکام است
سلطان جہانم بچنیں روز غلام است

میخوارم و سرگشتہ ام و رند و نظر باز
امروز چو ماہست دریں شہر کدام است؟

دوش رفتم بہ در مے کدہ خواب آلودہ
خرقہ تر دامن و سجادہ شراب آلودہ

آمد افسوس کناں مغبچۂ بادہ فروش
گفت بیدار شو اے رہرو خواب آلودہ

کبھی رندی و میخواری کے اقرار و اقبال میں غلو کو آپ اس قدر بڑھا دیتے ہیں کہ گویا چاروں طرف سے نصیحت ہونے لگتی ہے، ناصح نصیحت کرتے ہیں واعظ سمجھاتے ہیں لوگ منع کرتے ہیں مگر آپ پر اثر نہیں ہوتا فرماتے ہیں ؎

من نہ آں رندم کہ ترک شاہد و ساغر کنم   محتسب داند کہ من ایں کارہا کمتر کنم
خدا را اے نصیحت گو حدیث از مطرب و می گو   کہ نقشے در خیال ما ازیں بہتر نمی گیرد
نصیحت کم کن و ما را بفریاد دف و نے بخش   کہ غیر از راستی نقشے دریں جوہر نمی گیرد

کبھی اپنی رندی وغیرہ کو حکم قضا و قدر کے سر تھوپ کر آپ بری الذمہ ہو جاتے ہیں ؎

در کوئے نیکنامی ما را گزر ندادند   گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را
حافظ بخود نپوشید ایں خرقۂ مے آلود   اے شیخ پاکدامن معذور دار ما را
مرا روز ازل کارے بجز رندی نفرمودند   در انجا ہر چہ قسمت شد کم و افزوں نخواہد شد

کبھی اپنی رندی کا مذکورۂ بالا عذر پیش کر کے اپنے سمجھانے والے ناصح کے لئے بھی اپنا نسخہ تجویز فرما دیتے ہیں ؎

نصیحت گوئے رنداں را کہ با حکم خدا جنگ است   دلش بس تنگ می بینم چرا ساغر نمی گیرد؟

آخر عمر میں نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ آپ اس مذہب رندی کے شیخ المشائخ بن کر اسی کی تلقین و تبلیغ فرمانے لگتے ہیں ؎

اے نور چشم من سخنے ہست گوش کن   تا ساغرت پر است بنوشان و نوش کن
پیراں سخن بتجربہ گفتند گفتمت   ہاں اے پسر کہ پیر شوی پند گوش کن
تسبیح و خرقہ لذت مستی نہ بخشدت   ہمت دریں عمل طلب از میفروش کن
بر ہوشمند سلسلہ ننہاد دست عشق   خواہی کہ زلف یار کشی ترک ہوش کن

این خرقہ کہ من دارم در رہن شراب اولے — این دفتر بے معنی غرق مے ناب اولے
چوں عمر تبہ کردم چنداں کہ نگہ کردم — در کنج خراباتے افتادہ خراب اولے

نوش کن جام شراب یک منی — تابداں بیخ غم از دل برکنی
چوں زجام بیخودی رطلے کشی — کم زنی از خویشتن لاف منی
دل ہمے بر بند تا مردانہ وار — گردن سالوس تقوی بشکنی

اس نمونے سے ظاہر ہے کہ آخر آخر آپ کے صوفیانہ اقوال اور عارفانہ نصیحتیں مے و جام و صراحی وغیرہ استعارات میں بکثرت ادا ہونے لگتی ہیں لیکن آپ کی مے شراب نہیں رہتی اور ہی چیز ہو جاتی ہے۔

اعتراض ہو سکتا ہے کہ مقدس مضامین اور پاکیزہ نصائح و اقوال کو ناپاک و نجس اصطلاحات و الفاظ میں ادا کرنا کیا خوبی تعلیم و ہدایت کی ہے؟ مگر اصطلاحات رندی و میکشی میں پاکیزہ مطالب ادا کرنے کا رواج حافظ صاحب سے صدیوں پیشتر پڑ چکا تھا اوّل قرآن پاک میں کاساً دھاقا، "شرابًا طہورًا" ویسقون من رحیق مختوم ختامہ مسک" وغیرہ آیات میں اس کی بنیاد ملتی ہے پھر بزرگان دین کے کلام میں اس کے استعارات پائے جاتے ہیں مثلاً حضرت خواجہ بزرگ اجمیری، قدس سرہ سے منسوب یہ شعر ایک نہایت پاکیزہ امر حقیقت کو انہی اصطلاحات میں ادا کرتا ہے۔ ؎

شہ چوں خورد جام صفا بر خاک ریزد جرعہا — زاں رو شراب عشق را بر خاک آدم ریختہ

حضرت خواجہؒ کا زمانہ حافظ صاحب سے دو صدی پیشتر ہے۔ مذہبی روایات میں بھی جن کی بنیاد احادیث وغیرہ پر ہے روز ازل خدا تعالیٰ کے بندوں کو مست دیدار

بتلانے اور حضرت رسولِ خدا صلعم کے آخرت میں ساقیٔ کوثر بننے بھر بھر جام پلانے وغیرہ سے متبادر ہے کہ ان اصطلاحات میں کوئی ذاتی نجاست نہیں بہرحال حافظ صاحب سے اس روشِ کلام کی ایجاد منسوب نہیں ہوسکتی۔ آپ ان اصطلاحات میں اخلاق و معرفت کے بہترین اشعار کہنے کے ذمہ دار ہیں اور یہ کوئی قصور نہیں خصوصاً جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ سعدیؔ نے مشرق میں اور شیکسپیر نے مغرب میں کم یا بیش کھلے فحش الفاظ میں بھی پاکیزہ خیالات و نصائح کو ادا کرنے سے جہاں موقع آگیا ہے پرہیز نہیں کیا ہے حافظ صاحب کے تمام کلام میں ایک لفظ فحش نہیں نہ کوئی ذم کا پہلو نکلتا ہے جیسا کہ اس مصرع میں ؎

کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

اوّل اوّل حافظ صاحب کے کلام میں مے و میکشی کے استعارات زیادہ نہیں تھے آپ کی ابتدائی غزلوں میں یہ استعارات صرف اتنے ہی پائے جاتے ہیں جس قدر کہ کسی اور شاعر کے کلام میں مثلاً آپ کی سب سے پہلی غزل جو شیراز میں ترک وطن کرکے آکر بسنے کے بعد آپ نے فرمائی ہے یہ ہے۔ ؎

من دوستدارِ روئے خوش و موے دلکشم — مدہوشِ چشمِ مست و رُخِ صاف بیغشم
من آدم بہشتیم اما دریں سفر — حالے اسیرِ عشقِ جوانانِ مہوشم
در عاشقی گزیر نباشد ز سوز و ساز — استادہ ام چو شمع و مترسان ز آتشم
بخت ار مدد کند کہ کشم رخت سوئے دوست — گیسوئے حور گرد فشاند ز مفرشم
شیراز معدنِ لبِ لعلست و کانِ حسن — من جوہری مفلس از آن رو مشوشم
از بسکہ چشمِ مست دریں شہر دیدہ ام — حقا کہ می نمی خورم اکنون و سرخوشم

شہر یست پُر کرشمہ خوباں زشش جہت | چیزیم نیست ورنہ خریدار ہر ششم
گفتی زسرِ عہد ازل نکتہ بگو | آنگہ بگویمت کہ دو پیمانہ مے کشم

حافظ عروس طبع مرا جلوہ آرزو ست
آئینہ ندارم از آں آہ می کشم

یہ نو شعر کی غزل ہے بعض اس میں ایک شعر اور اضافہ کرکے تعداد اشعار کو طاق سے جفت کر دیتے ہیں جو حافظ صاحب کی عادت کے خلاف ہو وہ شعر یہ ہے

حافظ ز تابِ فکرتِ بے حاصلی بسوخت | ساقی کجاست تا زند آبے بر آتشم

بہرحال اس غزل میں ساقی و مے و جام وغیرہ کے استعارات میں کوئی غلو نہیں ہو صرف بقدر نمک ہیں جیسا کہ عموماً سب شعرا کے کلام میں ہوتے ہیں حقیقت میں یہ غزل آپ کی بیوگرفی کی کنجی ہے لیکن آپ کے کسی بیوگرفر کو نہیں سوجھی ہے اس سے آپ کا اوائل عمری میں پڑھ لکھ کر شاعر بنکر دولت دین اور دولت دنیا کمانے کے لیے علم و تصوف و شاعری میں قدم مارتے ہوئے دیہات سے شیراز آنا اور شیراز کے جو اسوقت عروس البلاد بنا ہوا تھا، ٹھاٹھ دیکھ کر حیران رہ جانا عاشق مزاج و حسن پرست ہونا قدم قدم پر دل کھونا مفلس ہونا، عروس طبع کو جلوہ نمائی کی آرزو، چھٹے شعر سے تصوف کے رموز کی طرف میلان خاطر اور چوتھے شعر سے ابتدا ہی میں آپ کے پاکیزہ ارادوں کی انتہائی بلندی دریافت ہوتی ہے دسویں شعر میں آپ کو اپنے افکار (اشعار) کی بے حاصلی یعنی خالی داد پانے کا شکوہ ہو اور آپ ساقی (کسی مربی) کو پکارتے ہیں تاکہ مفلسی کی شورشوں کو اپنی آبیاری سے بجھائے۔ ذیل کی غزل کو بھی اسی عہد کا کلام سمجھنا چاہیئے۔ اس غزل میں دیکھنے کی ایک بات یہ بھی ہے کہ حضرت کو ابتدا ہی سے

کیسا خداداد ملکہ اِن معمولی باتوں کو زبان تصوّف و شاعری میں گل وگلزار و دلچسپ بنا کر ادا کرنے کا حاصل ہے کہ آنکھیں چندھیا جاتی ہیں اصل مضمون جو اِن الفاظ میں گلپوش و نمایاں ہے جھلکیاں دِکھا دِکھا کر پھولوں میں چُھپ چُھپ جاتا ہے۔ ؎

ای دل آں بہ کہ خراب از مئ گلگوں باشی	بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی
در مقامے کہ صدارت بفقیراں بخشند	چشم دارم کہ بجاہ از ہمہ افزوں باشی
تاج شاہی طلبی گوہر ذاتی بنما،	ور خود از گوہر جمشید و فریدوں باشی
در رہ منزل لیلےٰ کہ خطرہاست بجاں	شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی
کارواں رفت و تو در خواب بیاباں در پیش	کے روی رہ ز کہ پرسی چہ کنی چوں باشی
نقطۂ عشق نمودم بتو ہاں سہو مکن،	ورنہ چوں بنگری از دائرہ بیروں باشی
ساغرے نوش کن و جرعہ بر افلاک فشاں	تا بچند از غم ایام جگر خوں باشی

حافظ از فقر مکن نالہ کہ گر شعر این است
ہیچ خوشدل نہ پسندد کہ تو محزوں باشی

مقطع میں فرماتے ہیں کہ:۔ حافظ! فاقہ کشی کی شکایت ہو تو نالہ نہ کر صبر کر اگر اشعار محزوں ہوگئے یعنی غم آلود لہجہ ہُوا تو شہر کے خوشدل (امرا) اہل توفیق جو تیرے کلام کے شائق ہیں اس کو پسند کرنا چھوڑ دیں گے اور تو خالی قدردانی سے بھی جائیگا ان الفاظ سے امرائے خوشدل کو ایک نفیس حُسنِ طلب کے ساتھ اپنی حالت بھی جتائی ہے کہ یہ کیا اندھیر ہے کہ کلام کے مزے لیتے ہو لیکن میں بھوکا مرتا ہوں اس کی کچھ خبر نہیں لیتے؟ غرض وہی مضمون اس مقطع کا بھی ہے جو گذشتہ غزل کے مطلع کا تھا کہ ؎

حافظ ز تاب فکرت بے حاصلی بسوخت ساقی کجاست تا زند آبے بہ آتشم؟

وہی پاکیزہ بلند ارادے اس غزل میں بھی ہیں وہاں یہ الفاظ تھے کہ۔

بخت از مدد کند کہ کشم رخت سوئے دوست گیسوئے حور گرد فشاند ز مفرشم

اس غزل میں الفاظ یہ ہیں مخاطب اپنا دل ہے فرماتے ہیں۔

بمقامے کہ صدارت بفقیراں بخشند چشم دارم کہ بجاہ از ہمہ افزوں باشی

اس کے دونوں مطلب ہیں یعنی اس دنیا میں جہاں لوگ صرف اپنی ذاتی سعی سے فقیر سے امیر ہو جاتے ہیں امیروں سے بھی بڑھ جاتے ہیں میں بھی سب سے فایق ہونا چاہتا ہوں، دوسرے معنی نفرت دنیا سے یہ ہیں کہ دنیاوی محفلوں میں نہیں بلکہ اُس طبقے میں جہاں صدارت درویشوں کو دیجاتی ہے (کونے معرفت و درویشی) بلند تر رہنے کی تمنا ہے!

تیسرے شعر میں دُنیاوی ترقی کی شرائط پر غور کرکے اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ اس کوچے میں جوہر ذاتی دکھانے کے بغیر کام نہیں چلتا یا نطفۂ جمشید و فریدون سے ہونا واجب ہو کہ تخت شاہی جوہر ذاتی سے یا استحقاق آبائی سے وراثتاً حاصل ہوتا ہے" اس مطلب کو اس طرح ادا کیا ہے کہ انہی الفاظ سے ایک بیش بہا نصیحت بھی پیدا ہے یعنی تاج شاہی اگر چاہیے تو ذاتی جوہر دکھا ورنہ فقط فریدوں و جمشید کا بیٹا ہونا کچھ کام نہیں دے سکتا"

چوتھے شعر میں فقرو درویشی میں ترقی کی شرائط پر غور کرکے اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ یہ بھی مشکلات بلکہ خطرات سے خالی نہیں بلکہ اس میں تو پہلی ہی شرط یہ ہے کہ مجنوں بن کر اس اکھاڑے میں اُتریئے

غرض یہ کہ یہ تمام غزل بھی حضرت کے ابتدائی ارادوں کی کشمکش اور آخر میں مفلسی کی شکایت اور مربّی کی طلب میں ہے۔ ان غزلوں سے یہ بھی متبادر ہوگا کہ حضرت کس کس طرح اپنے دردِ دل کو رنگین بنا کر غزلوں میں پیش کرتے تھے کہ وہ آپ کی روداد بھی ہوتیں اور خوش دلوں کے جلسہ ہائے رقص و سرود کے لئے دلکش راگ بھی ذیل کی غزل بھی اسی انداز کا ایک نمونہ ہے اس کے مقطع سے آپ کی ناکامی اس حد تک ظاہر ہوگی کہ حضرت تنگ ہوکر شیراز کو چھوڑ دینے کی بھی سوچتے ہیں؎

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم　　فلک را سقف بشگافیم و طرح دیگر اندازیم

یکے از عشق می لافد دگر طامات می بافد　　بیا کیں داوریہا را بہ پیش داور اندازیم

سخندانی و خوشخوانی نمی ورزند در شیراز

بیا حافظ کہ تا خود را بملک دیگر اندازیم!

اس شعر سے یہ بھی مترشح ہے کہ حضرت اس عرصے میں شیراز کے طبقۂ زہاد و صوفیہ دونوں کو دولت دنیا نہ سہی تو دولتِ دین ہی حاصل کرنے کی غرض سے ٹٹول چکے ہیں اور سوائے ازیں کچھ نہیں پاتے کہ ؎

"یکے از عشق می لافد دگر طامات می بافد الخ"، اس حالت کو دیکھ کر آپ کا میلان اہلِ سلوک سے متنفر ہوکر اہلِ جذب یعنی قلندری طریقے کی طرف ہوگیا ہے جس کے سرگروہوں میں ہمارے ہندوستان میں حضرت بوعلیشاہ قلندرؒ گزرے ہیں۔ اس فرقے کی راہ و روش میں پھلنے پھولنے کے جراثیم آپ کی طبیعت میں اوّل ہی سے موجود تھے اس غزل کے تمام لب و لہجے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپ کی طبیعت و مزاج میں کس قدر زور و شور کے ساتھ نشوونما پا چکے ہیں

اس عالم میں حضرت وطن مالوف کو واپس لوٹ جانے کی بھی ٹھانتے ہیں اور اپنے ارادے سے بحث کرتے ہیں۔ ؎

چرا نہ در پئے عزم دیارِ خود باشم | چرا نہ خاکِ کفِ پائے یارِ خود باشم
غمِ غریبی و غربت چو بر نمی تابم | بشہرِ خود روم و شہریارِ خود باشم
چو کارِ عمر نہ پیدا است بارے آں اولےٰ است | کہ روزِ واقعہ پیشِ نگارِ خود باشم
ز دستِ بخت گراں خواب و کارِ بے ساماں | اگر کنم گلہ رازدارِ خود باشم
ہمیشہ پیشۂ من عاشقی و رندی بود | دگر بکوشم و مشغولِ کارِ خود باشم

بود کہ لطفِ ازل رہنموں شود حافظ
دگرنہ تا بہ ابد شرمسارِ خود باشم

تیسرے شعر میں "کارِ عمر نہ پیدا است" کے یہ معنی تو ہیں ہی کہ عمر فانی ہے" لیکن یہ اشارہ بھی ہے کہ جو کچھ سوچا تھا اور منصوبے زندگی کے باندھے تھے وہ جب پورے نہیں ہوتے تو چلو یہاں سے وطن کو لوٹو اور اپنے سابقہ اشغال عبادات و ریاضیات میں (جن کو ظرافت سے رندی و عاشقی کہا ہے) مشغول ہو جاؤ ان پیروں سے تو کچھ رہنمائی نہ کی ممکن ہے کہ بحکم آیۂ "والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا" لطفِ ازل رہنمائی کرے اور راہِ معرفت مل جائے اور ازل سے ابد تک کی شرمساری یعنی زندگی میں معرفتِ حق حاصل نہ کرنے کی لعنت سے نجات ملے" ممکن ہے کہ یہ آخری دو غزلیں کسی اور موقع کی ہوں مگر پہلی دو غزلوں کے اس دور زمانہ کے افکار ہونے میں کوئی شک نہیں۔

غزلِ ذیل کے تیسرے چوتھے شعر میں حضرت تنگ احوالی سے اس درجہ عاجز

معلوم ہوتے ہیں کہ خودکشی جائز نہ ہونے اور موت نہ آجانے کا گلہ کرتے ہیں۔ ؎

کارم بدورِ چرخ بساماں نمی رسد　　خوں شد دلم ز درد و بدرماں نمی رسد

چوں خاک راہ پست شدم ہمچو باد و باز　　تا آبرو نمی رودم ناں نمی رسد

از دستبردِ جورِ زماں اہلِ فضل را　　ایں غصہ بس کہ دست سوئے جاں نمی رسد

سیرم ز جانِ خود بدل راستاں ولے　　بیچارہ را چہ چارہ کہ فرماں نمی رسد

تا صد ہزار خار نمی روید از زمیں　　از گلبنے گلے بہ گلستاں نمی رسد

بے پارہ نمی کنم از ہیچ استخواں　　تا صد ہزار زخم بدنداں نمی رسد

از حشمت اہلِ جہل بکیواں رسیدہ اند　　جز آہ اہلِ فضل بکیواں نمی رسد

حافظ صبور باش کہ در راہِ عاشقی
ہر کس کہ جاں نداد بجاناں نمی رسد

آخر آپ کو قدردان مل جاتا ہے یعنی حاجی قوام الدین حسن طمغچی وزیر شاہ ابو اسحاق فرمانروائے شیراز کے کان آپ کے رنگین نغموں سے مترنم ہوتے ہوتے اُس کا دل آپ کا آرزومند ہو جاتا ہے وہ آپ کو اپنی مصاحبت میں لے لیتا ہے اور بہت سا زمانہ سختیوں میں کاٹنے کے بعد آخر کار آپ کی عروس طبع کو جو آرزوئے جلوۂ شیراز آنے پر (پہلی غزل کے مقطع میں) تھی حاجی قوام کی بزم میں بذلہ سنجی اور نغزگوئی کی خدمت پر مامور ہو کر بر آتی ہے آپ نے اُس کی بزم کا فوٹوگراف ان الفاظ میں یادگار چھوڑا ہے جس میں محفل قرینے سے بیٹھی ہوئی، خُدام دست بستہ حاضر، سامانِ عیش مہیا مطرب شیریں نغمہ سرا، ساقی شکر دہن، ہوش رُبا خود حافظ صاحب بذلہ گو لطیفہ سنج اور حاجی قوام آپ پر زرپاشی سے

بخشش آموزی کرتا ہوا ایک قصرِ بہشت آئیں رشکِ فردوسِ بریں میں دکھایا گیا ہے ؎

عشق بازی و جوانی و شراب لالہ فام الخ

اُس کی بخششوں سے مالا مال ہوکر حضرت کا لہجہ بھی خوشدلی کا ترانہ ہو جاتا ہے اور آپ لہک لہک کر گانے لگتے ہیں ؎

ساقی بنورِ بادہ بر افروز جام ما — مطرب بگو کہ کارِ جہاں شد بکام ما

ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم — اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما

مستی بچشم شاہد دل بند ما خوش است — زان رو سپردہ اند بمستی زمام ما

ترسم کہ صرفۂ نبود روز باز خواست — نان حلال شیخ بہ آبِ حرام ما

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

بگرفت ہمچو لالہ دلم در ہوائے سرد — اے مرغ بخت کے شوی آخر تو رام ما

چنداں بود کرشمۂ و ناز سہی قداں — کآید بجلوہ سرو صنوبر خرام ما

دریائے اخضر فلک و کشتی ہلال — ہستند غرق نعمت حاجی قوام ما

حافظ ز دیدہ دانۂ اشکے ہمی فشاں
باشد کہ مرغ وصل کند قصد دام ما

اس غزل کے لہجہ سے جہاں آپ کی خوشدلی اور خوشحالی کا پتہ چلتا ہے دو باتیں اور مفہوم ہوتی ہیں (۱) آپ حاجی قوام کے غرقِ نعمت اور مصاحب بن کر اپنے ہمجنسوں کے محسود ہوگئے ہیں اور اُن کی طرف سے شربِ مدام، بادہ خواری اور شاہد پرستی کی طعن بازی ہو رہی ہے (۲) آپ خود کو اپنے اصل مقصد سے جس کو اس غزل میں "مرغ بخت" و "مرغ وصل" کے نام سے تعبیر کیا ہے ہنوز بے نصیب پاکر اس حین

راحت اور مسرت میں بھی افسردہ دل ہوجاتے ہیں لالے کی طرح جس کو ہوائے سرد جلائے دیتی ہے (۳) آپ اپنے معشوقِ مجازی کے عشق میں بھی بدستور بے چین ہیں اسی غزل کے یہ دو شعر اسپر شاہد ہیں ؂

ای باد اگر بگلشنِ احباب بگذری — زنہار عرضہ دہ بر جاناں پیام ما

گو نام ما زیاد بعمدا چہ میبری — خود آید آنکہ یاد نیاری زنام ما

آپ کے ہمجنس جن کے آپ محسود ہو گئے اُن کے تین مستقل گروہ سمجھنے چاہئیں۔

(۱) طبقۂ علما جس کے آپ تابندہ اختر تھے اور بڑی محنتوں اور عرقریزیوں سے آپ نے علوم میں کسب کمالات کئے تھے ؂

تحصیل عشق و رندی آسان نمود اوّل — جانم بسوخت آخر در کسب ایں فضائل

عشق و رندی سے مراد یہاں علم و حکمت ہے یہ آپ کے کہنے کا طریقہ ہے کہ اِس کو عشق و رندی فرماتے ہیں اور غزل کی تعریف کے دائرے سے خارج ہونے سے اپنے شعر کو بچاتے ہیں یعنی اگر صاف کہتے کہ میں نے علم و فضیلت بہت جان مار کر حاصل کی'' تو شعر تغزل کے دائرے سے نکل جاتا تھا۔ آپ کو باقاعدہ سندِ فضیلت حاصل تھی جسے آجکل ''ڈپلوما'' کہتے ہیں آپ کے وقت میں وہ دفتر کہلاتا تھا آپ کو علمیت کا لباس بھی دربارِ علم سے عطا ہوا تھا جسے آجکل ''گاؤن'' کہتے ہیں اُس زمانے میں خرقہ کہلاتا تھا فرماتے ہیں ؂

ایں خرقہ کہ من دارم در رہنِ شراب اولےٰ — ویں دفترِ بے معنی غرقِ مے ناب اولےٰ

آپ کو علما میں بڑی آبرو تھی یا آپ بڑے آبرو دار علما میں تھے اس شعر سے مترشح ہے ؂

ہر آبروئے کہ اندوختم ز دانش و دیں نثار خاک رہِ آں نگار خواہم کرد

ایک قطعے کے شعر میں اپنے دانش و فضل کا صاف اعتراف بھی کرتے ہیں ؎

فلک بہر دم ناداں دہد ز مام مراد تو اہل فضلی و دانش ہمیں گناہت بس

آپ عالم ہی نہیں بلکہ طبقۂ علما کے تابندہ اختر تھے" آپ کے ان اشعار سے متبادر ہے جس میں آپ نے اس طبقے کی حمایت اور اُس کی عام فاقہ کشی پر نوحہ فرمایا ہے ؎

از حشمت اہل جہل بکیواں رسیدہ اند جز آہ اہل فضل بکیواں نمی رسد

ایک اور غزل میں ہے ؎

کسے کو فاضل است امروز در دہر نمی بیند ز غم یک دم رہائی
ولیکن جاہل است اندر تنعّم متاع او بود ہر دم بہائی
نہ بخشندش چو سے از بخل و امساک اگر خود فی المثل باشد سنائی (حکیم سنائی)

اس طبقے نے مگر آپ کی حمایتوں کا یہ بدل دیا کہ آپ پر کفر کے فتوے لگائے اور آپ کو محکمۂ احتساب کے چنگل میں پھنسا کر جان و آبرو تک پر بنا دی۔ علماء و واعظین کا آپ سے رشک اور حسد حکام کے پاس پہونچکر آپ کے خلاف لگائی بجھائی کرنا ان اشعار سے بخوبی روشن ہے :۔ ؎

واعظ شحنہ شناس ایں عظمت گو مفروش زانکہ منزل گہ سلطاں دل مسکین منست

اس مطلع میں در پردہ غیبتیں کرنے کی طرف اشارہ ہے ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند چوں بخلوت میروند آں کار دیگر می کنند

ایک اور غزل میں بڑے لطف کے ساتھ اس طبقے کی غمازی کی طرف

اشارہ فرماتے ہیں ؎

واعظ شہر چو مہر ملک و شحنہ گزید　　من اگر مہر نگارے بگزینم چہ شود

دوسرا گروہ آپ کے حاسدوں کا صوفیہ یعنی مشائخ عہد تھے جن سے آپ کو ابتدائے عمر سے رازہستی دریافت کرنے کی دُھن اور معرفت حاصل کرنے کے شوق میں ہمیشہ لگاؤ رہا اور ایک طویل غزل اُن کی مدح سرائی میں وقف چھوڑی ہے جس کے چند شعر یہ ہیں :- ؎

روضۂ خلد بریں خلوت درویشانست　　مایۂ محتشمی خدمت درویشان ست

گنج عزلت کہ طلسمات عجائب دارد　　فتح آں در نظر ہمت درویشان ست

قصر فردوس کہ رضوانش بدربانی رفت　　منظرے از چمن نزہت درویشان ست

آنچہ زر می شود از پرتو آں قلب سیاہ　　کیمیائیست کہ در صحبت درویشان ست

آنچہ پیشش بنہد تاج تکبر خورشید　　کبریائیست کہ در حشمت درویشان ست

دولتے را کہ نباشد غم آسیب زوال　　بے تکلف بشنو دولت درویشان ست

حافظ ایں جا بہ ادب باش کہ سلطان و ملک
ہمہ در بندگی حضرت درویشانست

اس انتہائی مداحی کے صلے میں صوفیہ اور مشائخ نے بھی آپ کو ہدف ملامت بنانے میں کسر اُٹھا نہیں رکھی ثبوت اس کا ان اشعار سے بڑھ کر کیا ہوگا حضرت خود فرماتے ہیں ؎

مارا بر ندی افسانہ کردند　　پیران جاہل شیخان گمراہ
از قول زاہد صد بار توبہ　　وز فعل صوفی استغفراللہ!

تیسرا گروہ آپ کے حاسدوں کا شعرائے ہمعصر تھے جو آپ کی عوام میں مقبولیت اور خواص میں خصوصیت اور قدر و منزلت سے مارے حسد کے نعل در آتش تھے۔ ان کے حسد اور جلن کا گواہ یہ شعر ہے ؎

حسد چہ می بری اے سست نظم بر حافظ　　قبول خاطر و لطفِ سخن خدا داد است

ایک بار شاید کھلا معرکہ یا مقابلہ بھی کسی ہمعصر سے ہو جاتا ہے۔ میدان غالباً حافظ صاحب ہی کے ہاتھ رہا فرماتے ہیں ؎

حافظ ببر تو گوئے فصاحت کہ مدعی　　ہیچش ہنر نہ بود و خبر نیز ہم نداشت

اس فرقے کی بھی حمایت حقوق میں حافظ صاحب نے ایک شعر یادگار چھوڑا ہے بادشاہ سے سفارش کرتے ہیں :۔ ؎

مکارم تو بآفاق می برد شاعر　　از و وظیفہ و زادِ سفر دریغ مدار

؎　دیدمش دوش کہ سرمست و خراماں می رفت الخ"

یہ غزل بھی تمام و کمال کسی شاعر کی بادشاہ سے سفارش اور عذر خواہی تقصیر میں لکھی ہے لیکن بعض کا خیال ہے کہ اس شاعر سے مراد خود حضرت ہیں"

بہر حال حاسدوں کے ان تینوں طبقوں نے حافظ صاحب کو بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا یہ بات اُن شواہد سے جو دیوان میں بکثرت موجود ہیں اور خال خال ہم نے یہاں نقل کئے ہیں بخوبی ثابت ہے ثبوت کے نام ان لوگوں کی جھولی میں خود حضرت کے رندانہ کلام کے سوا کچھ نہ تھا مثلاً یہ قطعہ جس کو ہم اوپر حاجی قوام کی مجلس کا فوٹو گراف لکھ آئے ہیں ؎

عشق بازی و جوانی و شراب لعل فام　　مجلس اُنس و حریف ہمدم و شرب مدام

ساقیِ شکر دہان و مطربِ شیریں سخن
ہم نشیناں نیک کردار و ندیماں نیکنام

بزمگاہ دستاں چوں قصرِ فردوسِ بریں
گلشنے پیرامنش چوں روضۂ دار السلام

صف نشیناں نیک خواہ و پیشکاراں باادب
دوستداراں صاحب راز و حریفاں دوستکام

بادۂ درلطف و پاکی رشکِ آبِ زندگی
دلبرے در حسن و خوبی غیرتِ ماہِ تمام

غمزۂ ساقی بہ یغمائے خرد آہختہ تیغ
زلف دلبر از برائے صیدِ دل گسترده دام

ہر کہ ایں مجلس بجوید خوشدلی از وے مجوے
ہر کہ ایں عشرت نخواہد زندگی بروے حرام

نکتہ دانِ بذلہ گو چوں حافظِ شیریں سخن
بخشش آموز جہاں افروز چوں حاجی قوام

یہ قطعہ بظاہر حاجی قوام کی مجلس شراب کی رنگین تصویر اور اس میں حافظ صاحب کو بھی موجود دکھاتا ہے لیکن اگر اس کو مجلس شراب واقعی مان بھی لیا جائے تب بھی اُس میں حافظ صاحب کا کام نغز گوئی اور بذلہ سنجی سب سے علیحدہ دکھایا گیا ہے یعنی آپ اُس کی محفل کے لئے نفیس و مرصع غزلیں لکھا کرتے تھے بالفاظ دیگر آپ اُس کے شاعر دربار تھے۔ اِس واقعے سے آپ کا اُس کی مے نوشیوں اور اوباشیوں میں شریک و ملوث ہونا قطعی طور پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ خود ہمارے زمانے میں مرزا داغ ایسے شاعر گذرے ہیں اور اب کیا نہوں گے کہ شاعر دربار ہونے کے باوجود رئیس کے کاروبار عیش و عشرت سے انھیں کوئی سروکار نہیں۔ دوسرے حاجی قوام کو بھی اس تصویر محفل کی بنا پر عملاً مے نوش و اوباش تصور کرنا جائز نہیں کہ آخر حاجی تھا تیسرے اُس تصویر محفل کے آخری شعر کو دیکھو جو یہ ہے ؎

ہر کہ ایں مجلس بجوید خوشدلی از وے مجوے
ہر کہ ایں عشرت نخواہد زندگی بروے حرام

صریحاً ایک آئیڈیل بہترین سے بہترین جو خیال میں آسکے) مجلس بلکہ خود بہشت کی تصویر ہے جس کو دکھا کر حافظ صاحب یہ اارل Moral نکالتے ہیں کہ جو ایسی زندگی (یعنی جنتِ آخرت) کے لئے کوشش (اعمال نیک) نہ کریں حرماں نصیب ہیں اور اُن پر اُن کی پُر معصیت زندگی حرام ہے۔

اِس قطع میں اشعار یا اُن کے الفاظ بداہتاً الحاقی بھی ہیں خصوصاً یہ شعر ؎

بادہ گلرنگ و تلخ و عذب و خوشخوار و سبک" چونکہ اس سے پہلے شعر میں ؎

بادہ در لطف و پاکی رشک آب زندگی (شراب طہور) آچکا ہے مکرر بادہ کی تعریف اور وہ بھی اِس سے برعکس لانا ضد و تکرار فضول ہے نیز بادہ کا بہ یک وقت تلخ و عذب (شیریں) وخوشخوار و سبک" ہونا بھی غیر ممکن ہے، اور حافظ صاحب جیسے اعلیٰ شاعر سے ایسے خلاف واقعہ بے ربط توصیف اور ضد و تکرار کے الفاظ منسوب کرنا غلط،

شوخی طبع سے حریفوں کو اپنی نسبت بدگمانیوں کے لئے حضرت خود مواقع دیا کرتے تھے قطعہ منقولہ بالا ایک رنگین مجلس کا مرقع تھا تو غزل ذیل ایک رنگیلے دولہا کی تصویر ہے ؎

گل در برو مے در کف و معشوقہ بکام است	سلطان جہانم بچنین روز غلام است
گو شمع میارید درین جمع کہ امشب	در مجلس ما ماہ رخ دوست تمام است
در مجلس ما عطر میامیز کہ جاں را	ہر لحظہ ز گیسوے تو خوشبوے مشام است
از چاشنی قند مگو ہیچ وز شکر	زانرو کہ مرا با لب شیرین تو کام است
گوشم ہمہ بر قول نے و نغمہ چنگ است	چشمم ہمہ بر لعل لب و گردش جام است

از ننگ چہ گوئی کہ مرا نام زننگ است ۔ وز نام چہ پرسی کہ مرا ننگ زنام است
میخوارہ و سرگشتہ و رندیم و نظرباز ۔ امروز چو ما ہست دریں شہر کدام است
با محتسبم عیب مگوئید کہ او نیز ۔ پیوستہ چو ما در طلب عیش مدام است
در مذہب ما بادہ حلال است ولیکن، ۔ بے روئے تو اے شمع دل فروز حرام است

حافظ منشیں بے مے و معشوق زمانے

کایّام گل و یاسمن و عید صیام است

ایسی اور اس سے بھی بڑھ کر رندی وغیرہ کی تصویریں کلام میں موجود ہیں مگر ساتھ ہی اُس کے یہ مسلّم ہے کہ یہ سب تکلّف و تصنّع حاسدوں وغیرہ کے جلانے کے لئے غزلوں میں دانستہ گوارا فرمایا جاتا تھا اشعار کا یہ تمام لہجہ خصوصاً یہ شعر شاہد ہو کہ اس قسم کا کلام بیشتر علی الرغم مدعیان کہا جاتا تھا اس میں کچھ واقعیت نہ تھی ؎

ہمچو حافظ برغم مدّعیاں ۔ شعر رندانہ گفتنم ہوس است!

اس شعر میں حضرت کے اپنے اوپر خود رندی اوڑھنے اور منڈھنے کا انکشاف ہے تو شعر ذیل میں لوگوں کے آپ پر ناحق رندی تھوپنے کا راز فاش ہوا ہے فرماتے ہیں:-

دلقِ حافظ بچہ ارزد بمیش رنگیں کُن ۔ وانگہش مست و خراب از سر بازار بیار

یعنی حافظ بیچارے کے جامہ درویشی کی درہی کیا ہے، شراب اُس پر ہولی کے رنگ کی طرح ڈالدو اور جب وہ بڑبڑائے بُرا بھلا کہے تو اُسی حالت میں اُسے ہنکارتا بڑبڑاتا سر بازار کھینچ لاؤ لوگوں کو دکھاؤ کہ شراب پیکر مست اور باؤلا ہوگیا ہے! بالفاظ دیگر: مجھ غریب درویش کو آپ ہی تم لوگ شراب میں رنگو اور آپ ہی بدنام کرو"

تاریخ و حالات اور دیوان کے اشعار سے ثابت ہو کہ حاجی قوام کی مصاحبت سے ترقی

پاکر حضرت خود بادشاہ وقت شیخ بو اسحاق کے شاعر و ندیم ہو جاتے ہیں آپ کے خوشدلی کے ترانوں میں اور بھی بہار آ جاتی ہے غزل مذکورۂ بالا ؎

گل در بر و مے در کف و معشوقہ بکام است، آپکے عروج احوال کا ایک زبردست ترانہ ہو آپ اپنے حاسدوں پر غالب آ جاتے ہیں۔ بو اسحاق کے آخری وقت تک آپ سے کسی کو آنکھ ملا کر بات کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔

شاہ بو اسحاق کو تذکروں میں عیش پسند رنگیلا اپنے وقت کا محمد شاہ لکھا ہے خدا نے اُس کی تنبیہہ اور تخریب کے لئے ایک نادر شاہ (محمد مظفر فاتح یزد) بھی پیدا کر دیا جس نے شیراز فتح کرکے بو اسحاق کو اصفہان بھگا دیا جہاں وہ چار برس اور حکمرانی کرکے آخر اپنی شامت اعمال میں گرفتار ہو کر محمد مظفر کے ہاتھوں شیراز کے باہر میدان میں لاکر قتل کیا گیا حضرت نے اس قطعے میں کیسا کیسا لوگوں کو اس کی امداد کے واسطے اُبھارا ہو اور کیا کیا آنسو اُس کے عہد کی مجلسیں اور جلسے خاموش ہو جانے شیراز میں خون بہجانے شہر کے اجڑ جانے پر بہائے ہیں ؎

یاری اندر کس نمی بینیم یاراں را چہ شد ... دوستی کو آخر آمد دوستداراں را چہ شد
آب حیواں تیرہ گوں شد خضر فرخ پے کجاست ... خوں چکید از شاخ گل ہا دبہاراں را چہ شد
صد ہزاراں گل شگفت و بانگ مرغے بر نخواست ... عندلیباں را چہ پیش آمد ہزاراں را چہ شد
لعل از کان مروت بر نیامد سالہاست ... تابش خورشید و سعی باد و باراں را چہ شد
زہرہ سازے خوش نمی گیرد مگر عودش بسوخت ... کس ندارد ذوق مستی میگساراں را چہ شد
کس نمی گوید کہ یارے داشت حق دوستی ... حق شناساں را چہ حال افتاد یاراں را چہ شد
گوئے توفیق و کرامت درمیاں افگندہ اند ... کس بمیداں در نمی آید سواراں را چہ شد

حافظا اسرار الٰہی کس نمیداند خموش
از کہ می پرسی کہ دور روزگاراں را چہ شد

ایک اور قطعے میں بو اسحاق کے عہد رنگیں کی یاد اور اس کے احوال و انجام کی عبرت آموز تصویر کشی کی ہے اور اپنے ندیمانہ بلکہ محرمانہ تعلقات جتائے ہیں لیکن کچھ اور گمان نہ ہو" اس لیے اس کے ساتھ اپنی صحبت کو "سوسن و گل کی سی پاک صحبت" سے تشبیہہ دی ہے ؎

یاد باد آنکہ سر کوئے توام منزل بود — دیدہ را روشنی از خاک درت حاصل بود
راست چوں سوسن و گل از اثر صحبت پاک — بر زباں بود مرا آنچہ ترا در دل بود

مصرعہ دوم سے مراد غالباً یہ ہے کہ آپ اس کے دل پسند خیالات کو اشعار و غزل میں پرویا کرتے تھے ؎

دل چو از پیر خرد نقد معانی می جست — عشق می گفت بشرح آنکہ بروُ مشکل بود

یہ شعر گواہی دیتا ہے کہ آپ کی صحبت اس سے عالمانہ اور صوفیانہ تھی مہمات عقلی کو آپ تصوف کی راہ سے سمجھایا اور ذہن نشین کیا کرتے تھے

آہ ازیں جور تظلم کہ دریں دام گہ است — وائے زاں عیش و تنعم کہ دراں منزل بود
در دلم بود کہ بے دوست نباشم ہرگز — چہ تواں گفت کہ سعی من و دل باطل بود

بو اسحاق کے اُجڑے محلات و مکانات کی طرف آپ کا گذر ہوتا ہے ؎

دوش بر یاد حریفاں بخرابات شدم — خم مے دیدم و خوں در دل و پا در گل بود
بس بگشتیم کہ پرسم سبب درد فراق — مفتیِ عقل دریں مسئلہ لایعقل بود
راستی خاتم فیروزۂ بو اسحاقی — خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

دیدی آں قہقہۂ کبک خراماں حافظ
کہ ز سرپنجۂ شاہینِ قضا غافل بُود

مقطع میں اُس تاریخی قہقہے کی طرف اشارہ ہے جو بواسحاق نے محمد مظفر کے محاصرۂ شیراز کو اپنے بامِ قصر سے دیکھ کر لگایا تھا ان الفاظ کہ مظفر عجیب دیوانہ ہے کہ اس بہار کے زمانہ میں جو عیش و عشرت کے ایام ہیں لشکر کشی کے دردسر میں مبتلا ہوا ہے" مظفر شیراز کو فتح کر کے اپنے دارالسلطنت (یزد) کو چلا گیا اور شیراز دارالسلطنت کے بجائے ایک اُجڑا کھسٹا حاکم نشین شہر رہ گیا، امیر غریب، مالدار مفلس و نادار ہوگئے اور شاہ مفرور کے مقرب تمام بے اعتبار ہوگئے حافظ صاحب بھی اس گردش میں آگئے ممکن تھا کہ بواسحاق کے پاس اصفہان چلے جاتے مگر آپ نے شاید اس کے اطوار سے اُس کے انجام کو سمجھ لیا تھا اس کے پاس نہ گئے ذیل کی غزل سے مترشح ہوتا ہے کہ شیراز کو واپس لے لینے کے لئے بواسحاق نے جب ایک حرکت مذبوحی کر کے اصفہان کو ناکام واپسی کی ہے تو حافظ صاحب کو بھی پیام اپنے ساتھ چلنے کا دیا ہے جواب آپ نے یہ غزل لکھی ہے مطلع میں اپنے تمام ترقی اقبالمندی کو اُس کی سایہ پروری کی بدولت قرار دے کر اُس کے آنے پر اپنے شہر دل کے معطر و منور ہو جانے سے اُسے مطلع کرتے ہیں چھٹے شعر میں اُسے یقین دلاتے ہیں کہ میرا حال تیرے بغیر بیمار کا سا ہو جاتا ہے ساتویں شعر میں دعوت سفر و ہمراہی کا جواب ایسے انداز اور عجیب ذوجہت الفاظ میں دیتے ہیں جن کا خلاصہ یہ سمجھنا چاہئے کہ ایسے الفاظ ہیں جو ناگوار خاطر نہ ہوں ساتھ جانے سے معذرت پیش کرتے ہیں ؎

تا سایۂ مبارکت افتاد بر سرم — دولت غلام من شد و اقبال چاکرم
شد سالہا کہ از سرِ من بخت رفتہ بود — از دولتِ وصال تو باز آمد از درم

بیدار در زمانہ ندیدے کسے مرا | در خواب اگر خیال تو گشتے مصورم
من عمر در غم تو بپایاں برم ولے | باور مکن کہ بے تو زمانے بسر برم
زاں شب کہ یار در دل تنگم در آمدی | صد شمع در گرفت و ماغ معطرم
درد مرا طبیب نداند دوا کہ من، | بے دوست خستہ خاطر و با دوست خوشترم
گفتی بیار رخت اقامت بکوئے من | من خود بجان تو کہ ازیں کوئے بگذرم

ہر کس غلام شاہی و مملوک صاحبی است
حافظ کمینہ بندۂ سلطان کشورم

۵ گفتی بیار رخت اقامت بکوئے من" کو بروئے صنعت تجنیس، گفتی میار (مت لا)، رخت اقامت بکوئے من" بھی پڑھا جا سکتا ہے اور "ازیں کوئے بگذرم" کو "ازیں کوئے بگذرم" بھی پڑھ سکتے ہیں۔ صاف انکار بادشاہوں مربیوں سے نہیں ہو سکتا اس لئے حضرت نے ذو جہت الفاظ میں جواب دے کر صاف گوئی اور نغز گوئی دونوں کا حق ادا کر دیا ہے۔

حافظ صاحب جیسے معلم اخلاق کو اپنے مربی کی وفاداری سے پہلو تہی کا الزام دینے کی جرأت نہیں ہو سکتی کہ اُس وقت کے حالات کی کوئی تفصیل موجود نہیں۔ جو کچھ معلوم ہے اس غزل سے قیاساً مترشح ہے اُس سے ظاہر ہے کہ (۱) بو اسحاق کے شیراز سے بھاگنے پر اُس کی پھر واپسی کی امیدیں باقی تھیں چنانچہ اُس نے ایک بار سے زیادہ شیراز کو واپس لینے کے لئے تاخت کی (۲) حافظ صاحب شیراز میں رہ کر لوگوں کو اُس کے موافق اُبھارنے کی کوششیں اپنے دلوں میں اُتر جانے والے غیرت دلانے والے زوردار کلام سے کرتے رہے جس کا نمونہ یہ غزل آپ کی ۵

یاری اندر کس نمی بینیم یاراں را چہ شد"

او پر نقل ہو چکی، تسلط منظفری کے خلاف یہ غزل ایک کھلے سڈیشن کا حکم رکھتی ہے جو
مگر غزل ہونے کی وجہ سے گرفت میں نہیں آسکتا ہے

گوئے توفیق و کرامت درمیاں افگندہ اند   کس بمیداں در نمی آید سواراں را چہ شد

اس کے معنی صاف یہ ہیں کہ اپنا محسن بادشاہ میدان شہر میں محاصرہ ڈالے پڑا ہے
مردان شہر کیوں ہلہ کر کے اس سے نہیں جا ملتے اور اس کا ساتھ نہیں دیتے؟ گوئے توفیق
و کرامت سے مراد بو اسحاق کا سر بھی ہو سکتا ہے جو شیراز کے باہر میدان میں قتل کیا گیا تھا۔

شیرازیوں کو ابھارنے سے حافظ صاحب کی امیدیں غلط یا موہوم نہ تھیں آپ کے
عہد میں ایک بار ایسا ہو چکا تھا کہ پایۂ تخت سے شیراز کا والی مقرر کر کے بھیجا گیا مگر اس کو اہلِ
شیراز نے قبول نہیں کیا ہنگامہ کر کے نکال دیا (۴) حافظ صاحب کو بو اسحاق کے ساتھ نہ
جانے کا الزام دینا ایسا ہی ہے جیسے غالب مرحوم کی نسبت کہیں کہ وہ بہادر شاہ
کے ساتھ رنگون کیوں نہ چلے گئے۔ رنگون جانا تو کجا، مرزا نے تو غدر ہوتے ہی گھر کے دروازے
بند کر لئے اور کبھی قلعے میں جا کر بادشاہ کی شکل بھی نہ دیکھی۔ مگر حافظ صاحب کے بو اسحاق سے
اس کی تاخت کے دوران میں جا کر ملنے پر مندرجہ بالا غزل کے اشعار مشعر ہیں خصوصاً یہ شعر[۵]

زاں شب کہ بار در دلِ تنگم در آمدی الخ خبر دے رہا ہے کہ کسی شب آپ جا کر ملے
ہیں یا وہ شہر میں آکر آپ سے ملا ہے مگر آپ کا ہی جا کر اس سے ملنا قریں قیاس ہے بو اسحاق
کا شہر میں داخل ہونا تاریخ سے عیاں نہیں۔

بو اسحاق کے قتل ہو جانے پر اس کی طرف سے ساری امیدیں منقطع ہو جاتی ہیں
اور منظفر کو ناچار بادشاہ مان لینے کے سوا چارہ نہیں رہتا مگر اس سے پہلے بو اسحاق کو

آٹھ آٹھ آنسو رو لیتے ہیں یہ غزل بھی ایسے ہی موقع کی ہے ؎

مارا ز خیال تو چہ پروائے شراب ست
خم گو سر خود گیر کہ خمخانہ خراب است

گر خمر بہشت است بریزید کہ بے دوست
ہر شربتِ عذبم کہ دہند عین عذاب است

افسوس کہ دلبر شد و در دیدۂ گریاں
تحریرِ خیالِ خط او نقش بر آب است

بیدار شو اے دیدہ کہ ایمن نتوان خفت
زین سیل دمادم کہ دریں منزل خواب است

در بزم دل از روئے تو صد شمع برافروخت
ایں طرفہ کہ بر روئے تو صد گونہ حجاب است

سبز است در و دشت بیا تا نگذاریم
دست از سرِ آبے کہ جہاں جملہ سراب است

بے روئے دل آرائے تو اے شمع دل افروز
دل رقص کناں بر سرِ آتش چو کباب است

حافظ چہ شد ار عاشق و رند ست و نظرباز
بس طورِ عجب لازمِ ایامِ شباب است

مقطع میں خود پر رکھ کر بو اسحاق کے رنگیلے پن کی معذرت کی گئی ہے کہ ؎ بس طورِ عجب لازم الخ

فتح شیراز کے بعد مظفر یزد میں ہے اس کے عمال شہر پر سختیاں کر رہے ہیں، عزیزانِ شہر تنگ حال ہیں، فاقے مر رہے ہیں وظیفے گدا ے بند ہیں، ان حالات میں حضرت ایک غزل دربارِ یزد کو لکھ کر بھیجتے ہیں جس پر بیک وقت غزل، مدح، قصیدہ، اشتیاق نامہ شکایت نامہ، اطاعت نامہ دعا نامہ اور عرضداشت ہونے کا اطلاق ہے مطلع مدح و قصیدے کا شعر ہے ؎

اے فروغِ ماہِ حسن از روئے رخشانِ شما
آبروئے خوبی از چاہِ زنخدانِ شما

حسن مطلع اشتیاق کا شعر ہے ؎

عزم دیدار تو دارد جان برلب آمده　　　باز گردد یا برآید چیست فرمان شما

کے دہد دست این غرض یارب کہ ہمدستان شوند　　　خاطر مجموع ما زلف پریشان شما

شیراز کے حکام و عاملین کی شکایت ہے کہ انھوں نے ذمہ بیچار رکھا ہے ان کو دبا کر رکھنا چاہئے ؎

کس بہ دور نرگست طرفے نہ بست از عافیت　　　بہ کہ فرمایند مستوری بمستان شما

نوازش نامے فیض شمامے کے خواستگار ہیں ؎

با صبا ہمراہ بفرست از رخت گلدستہ　　　بو کہ بوے بشنویم از خاک بستان شما

اپنی حالت زار و اضطراب کو جتاتے ہیں اور بادشاہ کو اُس سے آگاہ کرنے کے متدعی ہوتے ہیں ؎

دل خرابی می کند دلدار را آگہ کنید　　　زینہار اے دوستاں جان من و جان شما

بادشاہ کے مقرب وزیروں کو کہ وہ بھی لازماً اُسی جیسے ملائے خشک ہوں گے ساقیان بزم جم کے طریق خطاب سے مخاطب فرماتے ہیں ؎

عمرتاں باد و مرادِ ای ساقیانِ بزم جم　　　گرچہ جام ما نشد پر مے بدوران شما

اس شعر میں جام سے مراد قدح مفلسی اور مے سے مراد زر وظیفہ ہے اور لطیف اشارہ اس واقعۂ تاریخ کی طرف بھی ہے کہ مظفر نے فارس کی فتح کے بعد شراب کی کشید اور فروخت و استعمال کی نہایت سختی سے ممانعت کر دی تھی شراب عنقا ہو گئی تھی" دربار یزد کو شیرازیوں کے حقوق اور وظیفوں گذاروں وغیرہ کے اجرا کے لئے جو بند پڑے ہیں ابھارتے اور توجہ دلاتے ہیں ؎

اے صبا با ساکنان یزد از ما بگو　　　کاے سر ناحق شناساں گوئے میدان شما

گرچہ دوریم از بساط قرب ہمت دور نیست
بندۂ شاہ شمائیم و ثنا خوانِ شما

آخر خود بادشاہ محمد مظفر سے فریاد کرنے لگتے ہیں ؎

اے شہنشاہ بلند اختر خدا را ہمتے
تا ببوسم ہمچو گردوں خاکِ ایوانِ شما

مصرعۂ دوم میں خالی کھٹکتی نہیں ہے مصرعۂ دویم کے ذریعہ حضرت شاعرانہ مبالغے کے اس مشہور شعر کو بھی چھونا چاہتے ہیں ؎

نہ کرسیٔ فلک نہد اندیشہ زیر پا
تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلاں دہد!

بادشاہ کو شہنشاہ کرکے مخاطب کرتے ہیں اشارہ اس کے شاہ بو اسحاق کو مغلوب کرکے شاہاں شاہ ہوجانے کی طرف بھی ہے آئندہ شعر میں نہ صرف اپنی بلکہ اکثر عزیزانِ شہر کی تباہ حالی کی طرف توجہ منعطف کرلیتے ہیں ؎

دور دار از خاک و خوں دامن چو بر ما بگذری
کاندریں رہ کشتہ بسیار اند قربانِ شما

نفسی نفسی میں لوگ اپنے آگے اوروں کو بھول جاتے ہیں اور اپنے ہی قدرح کی خیر مناتے ہیں یہ حافظ صاحب کے شرف انسانیت کی دلیل ہے کہ انھوں نے اپنی درخواست میں اوروں کی نالش کو بھی برابر کی جگہ دی ہے یہ فرما کر کہ ؎

کاندریں رہ کشتہ بسیار اند قربانِ شما

یعنی قربانت شوم یہاں تو مجھ جیسے ہزاروں دل جگر کٹے پڑے ہوئے ہیں!

مقطع میں دعا کو ہاتھ اٹھاتے ہیں اور خلق شیراز سے آمین دگر قبول افتد زہے عز و شرف

میکند حافظ دعا بشنو و آمیں بہ گو
روزیٔ ما باد لعل شکر افشانِ شما!

یعنی آپ کے شکر افشاں (لب) سے حکم ہم لوگوں کی پرورش و اجرائے وظائف و حقوق کا ہو جائے!

لوگ اس کو غزل سمجھتے ہیں حالانکہ یہ ایک نالش و فریاد ہے، حافظ صاحب کے کمال شاعری نے اُس کو گلدستہ بنا کر ایسے اشعار میں پیش کیا ہے جو غزلیت کی جان ہیں۔ فریادیں پھولوں میں منہ چھپائے ہوئے ہیں غالب کا شعر اس پر کس قدر صادق آتا ہے ؎

جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا ۔۔۔ اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گل!

درحقیقت حافظ صاحب نے اِس غزل میں سانپ کو کھلایا ہے، مظفر ایک نہایت درندہ صفت مطلق العنان، خشک مزاج، تُرش رُو حیوان اور قتّال تھا اُس کو فخر تھا کہ اُس نے خاص اپنے ہاتھ اور اپنی تلوار سے آٹھ سو گردنیں اُڑائی ہیں" ایک بار قرآن پڑھتے پڑھتے اُٹھ کر ایک آدمی کو جو اُس کے سامنے لایا گیا تھا قتل کر دیا۔ اور پھر مصروف تلاوت ہو گیا! ایسے شخص سے اُس کی حکومت کی شکایت کرنے کا زہرہ مشکل تھا حافظ صاحب نے اس خوبی کے ساتھ اس غزل میں اِس کا حق ادا کیا ہے کہ آپ کو اوّل درجے کا مزاج شناس کورٹیر (درباری) اور ڈپلومیٹک پلیڈر بھی کہنا چاہیئے!

ایک طرف تو یہ سنجیدہ شکایت اور وکالت ہو رہی تھی۔ دوسری جانب آپ کی زندہ دلی نے دخترِ رز کی گم شدگی (عہدِ مظفری میں شراب کی ممانعت اور بندی) کا یہ اشتہار جاری کر رکھا تھا اور ڈھنڈیا ڈال رکھی تھی:- ؎

بر سرِ بازارِ جاں بازاں منادی می‌زنند ۔۔۔ بشنوید اے ساکنانِ کوئے شادی بشنوید
دخترِ رز چند روزے شد کہ از ما گم شدست ۔۔۔ رفت تا گیرد سرِ خود ہاں و ہاں حاضر شوید
جامۂ دارد ز لعل و نیم تاجے از حباب ۔۔۔ عقل و دانش می برد تا ایمن از وے نغنوید

دخترے شبگرد و تلخ و تند و گلرنگ است و مست
گر بیابیدش بہ سوئے خانۂ حافظ برید!

کبھی میخانوں کے کھل جانے کی دعا فرمائی جا رہی تھی :- ؎

بُود آیا کہ درِ میکدہا بکشایند   گرہ از کارِ فروبستۂ ما بکشایند

یہ "کارہائے فروبستہ وہی وظیفے اور گذارے اور حقوق تھے جن کے اجرا کے لئے یزد کو وہ غزل بھیجی گئی تھی جس کی ہندی کی چندی اوپر کی جا چکی ہے۔ بظاہر ایک مُلّائے خشک تھا حافظ صاحب غزل گو شاعر تھے ایسی غیر شرعی خدمات کی اُس کو ضرورت نہیں تھی اُس کے پیش دست مُلّایانِ خشک نے بھی ایسے اسراف کا فتویٰ نہ دیا ہوگا۔ بہرحال حافظ صاحب کی وہ غزل یا عرضداشت اغلباً نامنظور اور وظیفہ آپ کا مسدود ہی رہا فرماتے ہیں۔ ؎

اگر از بہرِ دلِ زاہد خود بیں بستند   دل قوی دار کہ از بہرِ خدا بکشایند

بادشاہ کو مُلّائے خشک دیکھ کر اہلِ دنیا عبا و قبا و لباس زہد و تقوی پہن کر اُس کے گرد و پیش جمع ہو گئے ہوں گے اور اپنی مکّاریوں سے اُس کی مُلّائیت کی آبیاری کرتے ہوں گے اِس شعر میں اُس کی طرف اشارہ ہے۔ ؎

درِ میخانہ ببستند خدایا مپسند   کہ درِ خانۂ تزویر و ریا بکشایند

آیندہ دو شعر دخترِ رز کا مرثیہ ہیں اور کُھلّم کُھلا ظرافت کے اشعار ہیں صاحب شعر العجم پر تعجب و افسوس ہے کہ وہ اِن کو شراب بند ہو جانے پر حافظ صاحب کے دلی رنج و غم کے اظہار میں سمجھ کر ایک ناگفتہ اشارہ حافظ صاحب کے رند و میخوار ہونے کا کرتے ہیں ؎

گیسوئے چنگ ببرید بمرگِ مئے ناب   تا ہمہ مغبچگاں زلفِ دوتا بکشایند

نامۂ تعزیتِ دخترِ رز بنویسید ،   تا حریفاں ہمہ خوں از مژہا بکشایند

ڈھنڈورے والی غزل سے اوپر ظاہر ہو چکا ہے کہ حافظ صاحب کی شاعرانہ طبیعت کو جو لطیفے اور نغز ممانعت شراب کی سختی میں سوجھتے تھے وہ ادا ہو رہے ہیں نہ کہ حافظ صاحب غم شراب میں خود مبتلا ہیں!

البتہ ایک گروہ تھا جو حقیقت میں غم شراب میں مبتلا تھا کیونکہ اُس کی تجارت اور معاش بالکل جاتی رہی تھی یعنی ایران کے قدیم باشندے مغ (پارسی) جو شراب کشی اور شراب فروشی سے ہی بسر کرتے تھے اور اُن کی شراب شیرازی دنیا میں مشہور اور دور دور تیار ہو کر جاتی تھی مظفر کو ان لوگوں کی تجارت کو بند کرنے کا شرعاً کوئی حق نہ تھا "تا ہمہ مغبچگاں زلف دوتا بکشایند" میں انہی لوگوں کی تباہی و بربادی کی طرف اشارہ ہے۔

شعر ذیل میں حافظ صاحب اثر دعا کی نسبت تقریباً وہی خیال ظاہر کرتے ہیں جو الفریڈ لارڈ ٹینی سن انگلستان کے گذشتہ صدی کے سب سے بڑے مسلمہ شاعر نے اپنی نظم (پاسنگ آف آرتھر) میں ظاہر کیا ہے وہ کہتا ہے کہ:-

آدمی کے خیال میں بھی نہیں آسکتی یہ بات کہ دعاؤں سے کیسے کیسے کام انجام پا جاتے ہیں! کئی صدی بعد اُس نے کہا حافظ صاحب اُس سے کئی صدی پیشتر حلف و قسم اور دعوے کے ساتھ فرما چکے تھے:-

بصفائے دل رندان صبوحی زدگاں بس در بستہ بمفتاح دعا بکشایند!

آخر میں اس صوفیانہ جبّے اور خرقے کی بھی خبر لی ہے جسے پہن پہن کر دنیا طلب لوگ مظفر کے پٹھوں میں گھسے ہوئے اُس کے تقشف کا آلۂ کار بنے ہوئے تھے اور اسے صدقِ صد سے بڑھا رہے تھے ؎

حافظ ایں خرقۂ پشمینہ بہ بینی فردا کہ چہ زنار ز زیرش بجفا بکشایند

مظفر کے نہ صرف شراب بلکہ نغمہ (قوالی) بھی بند کر دینے پر حضرت کی ایک نفیس غزل کے یہ دو شعر بھی عجیب پر لطف و پُر مذاق ہیں۔

یا رب چہ جرم کرد صراحی کہ خونِ خُم — با نغمہائے قلقلش اندر گلو ببست
مطرب چہ نغمہ ساخت کہ در پردۂ سماع — بر اہلِ وجد و حال در ہائے و ہو ببست

غزل ذیل کے مقطع سے جس میں حافظ صاحب بغداد و تبریز پر یورش کا قصد ظاہر فرما رہے ہیں (لیکن اس سے پیشتر کے اشعار تمام عہد مظفری کی خونریزیوں اور تقشف پر دال ہیں) مزید تائید اس خیال کی ہوتی ہے کہ مظفر سے اپنی پرورش اور اجرائے وظیفہ کی کوششوں میں حضرت ناکام رہے اور ارادہ شیراز کو چھوڑ کر تبریز و بغداد کا فرماتے ہیں جہاں کے فرمانرواؤں سے غالباً آپ کو قدردانی کی اُمیدیں ہیں ؎

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گل بیز است — ببانگِ چنگ مخور مے کہ محتسب تیز است
صراحی و حریفے اگر بدست افتد — بعقل نوش کہ ایام فتنہ انگیز است
در آستینِ مرقع پیالہ پنہاں کن — کہ ہمچو چشم صراحی زمانہ خوں ریز است
ز رنگ بادہ بشوئید خرقہ ہا از اشک — کہ موسم ورع و روزگار پرہیز است

ذیل کے شعر میں مظفر کو یہ عبرت آموز چشم نمائی بھی فرمائی ہے ؎

سپہر برشدہ پرویز نیست خوں افشاں — کہ قطرہ اش سر کسریٰ و تاج پرویز است

عراق و پارس گرفتی بشعر خود حافظ
بیا کہ نوبت بغداد و وقت تبریز است

حاجی قوام وزیر کے تقرب و ہم نشینی اور بو اسحق رنگیلے کی ندیمی اور محرمی کے زمانے سے آپ پر اشتغال رندی میں شرکت کی نادیدہ تہمتیں ان حریفوں کی طرف

جن کو اُن مجلسوں میں رسائی نہ تھی اور رشک سے سوختہ ہو رہے تھے لگائی جا رہی تھیں اور افواہیں تراشی جا رہی تھیں اور آپ بھی اُن حریفوں کے علی الرغم ایک رندکی حیثیت و لباس غزلوں میں اختیار کئے ہوئے تھے منظفر کے عہد میں ان حریفوں کی بن آتی ہے اُس کی بارگاہ سے آپ راندے اور اُس کی عنایات سے محروم رکھے جاتے ہیں ناچار آپ ایک زخمی دل سے استغنا اختیار کرتے ہیں۔ مطلع ذیل میں "زاہد ظاہر پرست" منظفر ہے جس نے شاید آپ کی نسبت دریدہ دہنی کے کلمات بکے ہیں ؎

زاہد ظاہر پرست از حال ما آگاہ نیست — در حق ما ہر چہ گوید جائے، ہیچ اکراہ نیست
ایں چہ استغناست یارب ایں چہ قادر حاکم است — کیں ہمہ زخم نہان است و مجال آہ نیست
صاحب دیوان ما گویا نمید اند حساب — کاندریں طغرے نشان حسبتہً للہ نیست

طغرا سے مراد یہ ہے کہ بادشاہ کا جو فرمان اہل شیراز کے تصفیہ حقوق میں وارد ہوا ہے اس میں ہمارا (فقیر حافظ) کا نام نہیں۔

دربار شاہی سے مایوس ہو کر دربار الٰہی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ؎

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو — گیر و دار و حاجب و درباں دریں درگاہ نیست
ہر چہ ہست از قامت ناساز و بے اندام ماست — ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

شیوخ و زہاد کی جو منظفر پر حاوی تھے اطوار چشمی کی شکایت کرتے ہیں ؎

بندۂ پیر خراباتم کہ لطفش دائم است — ورنہ لطف شیخ و زاہد گاہ ہست و گاہ نیست

اپنی عالیمقامی بلند فطرتی اور استغنا جتاتے ہیں۔

حافظ از بر صدر ننشیند ز عالی ہمتی است — عاشق دُردی کش اندر بند مال و جاہ نیست

اس غزل میں آئندہ شعر آپکے آئندہ عزم و تدبیر کے متعلق نہایت اہم اشارہ رکھتا ہے اور

آپ فرماتے ہیں کہ بادشاہ پر تو ہماری چال، چلتی، نہیں اب ہم ایک چھوٹا مُہرہ (پیادہ) چل کر دیکھیں گے اور بازی کو پلٹنے کی کوشش کریں گے :-

عرصۂ شطرنج رنداں را مجال شاہ نیست — تا چہ بازی رخ نماید بیدقے خواہیم راند

شطرنج کھیلنے والے جانتے ہیں کہ پیادہ بڑھ کر آخر بادشاہ کی جگہ پہونچ جاتا ہے حافظ صاحب کی شطرنج رنداں کا یہ پیادہ محمد مظفر کا فرزند اکبر شہزادہ شجاع ثابت ہوتا ہے جو غالبًا مظفر کی طرف سے شیراز کا نائب بن کر جاتا ہے اور اُس کا دربار وہاں جمتا ہے۔ اس شاہزادے ولیعہد سے حافظ صاحب کی ملاقات ہو جاتی ہے جو بڑھ کر عشق و خلوص کے درجے تک پہونچ جاتی ہے۔ تُرک بچوں کا حُسن مشہور ہے تُرک شہزادوں کے حُسن کے تو پھر کیا کہنے کہ حسین ترین ماؤں کے بطن سے یعنی سچ مچ حور نژاد ہوتے ہیں صورت دیکھتے ہی حافظ صاحب چیخ مارتے ہیں ؎

یارب این شمع شب افروز ز کاشانۂ کیست — جان ما سوخت بپرسید کہ جانانۂ کیست
حالیا خانہ برانداز دل و دین من است — تاہم آغوش کہ می باشد و ہمخانۂ کیست
دولتِ صحبت آں شمع سعادت پرتو — باز پرسید خدا را کہ بہ پروانۂ کیست
یارب آں شاہ وش ماہ رخ زہرہ جبیں — دُرِ یکتائے کہ و گوہرِ یک دانۂ کیست
میدہم ہر کشش افسونے و معلوم نہ شد — کہ دلِ نازکِ او مائل افسانۂ کیست

گفتم آہ از دلِ دیوانۂ حافظ بے تو!
زیر لب خنداں زناں گفت کہ دیوانۂ کیست

اِس سے مگر یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ حافظ صاحب پر امرد پرستی نے زور کیا اور سچ مچ ایسا واقعہ گزرا کہ اُس شاہ وش، ماہ رُخ، زہرہ جبیں، کو دیکھتے ہی حافظ صاحب دل

پکڑ کر بیٹھ گئے اور یہ غزل گانے لگے۔ مدعا آپ کا ایک ایسی حسین و پُر شور غزل لکھنا ہو جو شہزادے کے کانوں تک پہونچے بغیر نہ رہے اُس کی بزم میں گائی جائے اور اُس کو آپ کے حال پر متوجہ اور قدرداں بنالے غزل ذیل کا مقطع گواہ ہے کہ بزم شاہزادہ کے لئے غزلیں لکھ کر پہونچائی اور وہاں گائی جاتی تھیں ؎

عید است و موسم گل ساقی بیار بادہ ہنگام گل کہ دیدست بے مے قدح نہادہ

عہد مظفری کے زہد و تقویٰ میں افراط و تفریط کی طرف شعر ذیل میں لطیف اشارہ ہے ؎

زیں زہد و پارسائی بگرفت خاطر من ساقی پیالہ دہ تا دل شود کشادہ

مطرب چو پردہ ساز د شاید اگر بخواند

از طرز شعر حافظ در بزم شاہزادہ

ایک حسین و رعنا جوان ہونے کے علاوہ تاریخ سے ظاہر ہے کہ شجاع علوم عربی کا پورا عالم، حافظ قرآن اور اچھا شاعر بھی تھا اِدھر حافظ صاحب جیسے یکتائے دہر فرید وقت، بذلہ سنج نغز گو خوش گفتار، خوش صحبت، دلچسپ پاکیزہ و مقبول و محبوب شخصیت تھی، حافظ صاحب تو اُس کے حسن و قابلیت کے مداح تھے ہی شہزادہ بھی آپ کا فریفتہ و گرویدہ ہو گیا تھا شہزادے نے آپ کو اور آپ نے شاہزادے کو موہ لیا تھا دونوں کی دوستی کے چرچے دُور دُور مشہور تھے، شجاع کو یہ تعلقات جو آپ کے اور اُس کے درمیان تھے آپ نے دو مسلسل غزلوں میں جبکہ وہ بادشاہ ہو کر آپ سے بے پروا ہو گیا یاد دلائے ہیں ایک غزل کا مطلع اور چند اشعار یہ ہیں ؎۔

پیش ازینت بیش ازیں غمخواری عشاق بود   مہرورزی تو با ما شہرۂ آفاق بود

یاد باد آں صحبت شبہا کہ با زلف توام   بحث سرّ عشق و ذکر حلقۂ عشاق بود

حسن مہرویاں مجلس گرچہ دل میبرد و دیں   عشق ما بر لطف طبع و خوبی اخلاق بود

یعنی تیری مجلس کے حسین دل و دین چھینتے تھے مگر میرا عشق پاک اور خوبی اخلاق پر مبنی تھا"

دوسری غزل کا مطلع و اشعار بھی انہی تعلقات کی گواہی دیتے ہیں :- ؎

یاد باد آنکہ نہانت نظرے با ما بود   رقم مہر تو بر چہرۂ ما پیدا بود

یاد باد آنکہ چو چشمت بعتابم می کشت   معجز عیسویت در لب شکرخا بود

یاد باد آنکہ مہ من چو کلہ بشکستے   در رکابش مہ نو پیک جہاں پیما بود

یاد باد آنکہ رخت شمع طرب می افروخت   من دل سوختہ پروانۂ بے پروا بود

یاد باد آنکہ دراں بزمگہ خلق و ادب   آنکہ او خندۂ مستانہ زدے صہبا بود

یعنی تیری بزمگہ خلق و ادب میں اگر کچھ بیہودہ چیز تھی تو وہ شراب تھی ؎

یاد باد آنکہ چو یاقوت قدح خندہ زدے   در میان من و لعل تو حکایت ہا بود

یعنی جب تو شراب پیتا تھا تو میری تیری اسپر بڑی تکرار رہا کرتی تھی ؎

یاد باد آنکہ خرابات نشیں بودم و مست   آنچہ در مجلسم امروز کم است آنجا بود

حافظ صاحب اور شجاع کے باہم مشورات شعر و سخن بھی ہوا کرتے تھے بلکہ جس طرح شاہزادہ فرماتا اس طرح شعر منظوم کئے جاتے تھے ؎

یاد باد آنکہ باصلاح شما میشد راست
نظم ہر گوہر ناسفتہ کہ حافظ را بود

الغرض دونوں کی خوب گھٹتی تھی اور اُس کے چرچے دُور دُور پہونچے تھے مظفر کے بھی گوش زد کیوں نہ ہوتے دشمنوں کو خوب کان بھرنے کا موقع ملا اور آپ کی غزلوں سے وہ پہلے ہی آپ کو ایک رند و مے خوار سمجھے بیٹھا تھا (تاریخ میں مذکور ہے کہ) بیٹے کی شراب نوشی کی خبر سُن کر اُس کو قید کر دیا (اور دیوان سے پتہ چلتا ہے کہ) حافظ صاحب پر بھی عتاب نازل ہوا آپ نے اپنی صفائی میں یہ نفیس نغمہ سرائی اُس کے کانوں تک پہونچانے کی کوشش فرمائی ہے مطلع میں خانوادۂ مظفری سے اپنی وفاداری کا یقین دلاتے ہیں ؎

مرا عہدیست باجاناں کہ تا جاں در بدن دارم ہوا داری کویش را بجان خویش دارم

دوسرے شعر میں ماہ ختن (مظفر) کے دیدار سے اپنی چشم ظاہر کو منور کر کے شمع چگل (شاہزادہ) کے حسن سے اپنی خلوت باطن کو روشن جتاتے ہیں بالفاظ دیگر اُس سے قلبی محبت کا شعر ذیل میں اقرار کرتے ہیں ؎

صفای خلوتِ خاطر ازاں شمع چگل جویم فروغ چشم و نور دل ازاں ماہ ختن دارم

مظفر کا وطن خطا و ختن کی طرف تھا اس لئے اُسے ماہ ختن سے تشبیہہ دی ہے اور بمقابلہ اُس کے شہزادے کو شمع چگل (چینی لالٹین) سے۔ جو بڑی خوشنما ہوتی ہے ؎

بکام و آرزوئے دل چو دارم خلوتے حاصل چہ فکر از خبث بدگویاں میانِ انجمن دارم

فرماتے ہیں کہ مجھے ایسی خلوت حاصل ہے جس میں کسی کو پہونچ ہی نہیں پس (بزم بادشاہ میں) بدگوئی کرنے والوں سے مجھے کچھ خوف نہیں کہ وہ عینی شہادت پیش ہی نہیں کرسکتے ؎

شراب خوشگوارم است و یار مہرباں ساقی ندارد ہیچ کس یارے چنیں یارے کہ من دارم

اس شعر میں آپ نے اپنی شراب خوری کے الزام کو بظاہر تسلیم کر لیا ہے لیکن ساتھ ہی اپنی شراب کو شراب خوشگوار کہہ کر آب کوثر سے ملا دیا ہے اور یار مہرباں ساقی کی

اِس تعریف سے کہ ؎

ندارد ہیچ کس یارے چنیں یارے کہ من دارم" شعر کو حضرت رسول کریم کی نعت میں پہونچا دیا ہے۔

ذیل کے اشعار میں آپ فرماتے ہیں کہ میرے گھر میں میری بیوی حسین موجود ہے مجھے کسی سروِ بستانی (رنڈی منڈے وغیرہ) کی کیا ضرورت ہے میں ان آلائشوں سے بری ہوں میری نسبت یہ خیالات باطل ہیں اگر سو لشکر خوباں بھی چڑھ آئیں تو ایک بُت لشکر شکن میرے پاس موجود ہے جو میری عصمت کی پناہ ہے ؎

مرا در خانہ سروے ہست کاندر سایۂ قدش — فراغ از سروِ بستانی و شمشاد چمن دارم

چو در گلزار اقبالش خرامانم بحمد اللہ — نہ میلِ لالہ و نسریں نہ برگِ یاسمن دارم

الا اے پیرِ فرزانہ مکن منعم ز میخانہ — کہ من در ترکِ میخانہ دلِ پیماں شکن دارم

پیرِ فرزانہ کہہ کر بڈھے خرانٹ بادشاہ مظفر کو مخاطب فرمایا ہے اس شعر کے گوناگوں معانی کی پیشتر تشریح کی جا چکی ہے ؎

بزندی شہرہ شد حافظ پس اَزچندیں ورع اما، — چہ غم دارم چو در عالم امین الدین حسن دارم

مقطع میں آپ شکایت و افسوس فرماتے ہیں کہ عمر بھر ایسے اتقا اور ورع سے زندگی گذارنے پر بھی مجھے رندی سے مطعون و منسوب کیا گیا خیر۔ امین الدین حسنؒ (اُس وقت کے ایک بڑے بزرگ دین جن کو مظفر بھی مانتا تھا) میرے پرہیز و اتقا کے واقف و گواہ ہیں جب تک وہ زندہ ہیں مجھے کوئی اندیشہ نہیں" مُراد یہ بھی ہے کہ بادشاہ پہلے اُن سے پُوچھ لے پھر میری نسبت کوئی حکم صادر کرے نیز امین الدین حسنؒ کو بھی اشارہ ہے کہ وہ بادشاہ کے خیالات میری نسبت ٹھیک کر دیں۔ لیکن کلام سے اِس کا سراغ

کہیں نہیں ملتا کہ بادشاہ مظفر آپ سے کبھی بھی راضی یا ٹھیک ہوا۔ اتنا ضرور ہوا کہ آپ کی جان اُس کی سفاک تلوار سے بچی رہی۔

شہزادے کو قید میں سن کر آپ اُس کی رہائی کے لئے ذیل کی غزل میں تڑپتے اور پھڑکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں پہلے چند شعر تغزل میں ہیں یا اُن کے اشارات اب مردہ ہوگئے ہیں سمجھ میں نہیں آتے ۔

اے دل اگر از چاہ زنخداں بدر آئی — ہر جا کہ روی زود پشیماں بدر آئی

ہشدار کہ گر وسوسۂ عقل کنی گوش — آدم صفت از روضۂ رضواں بدر آئی

آگے فرماتے ہیں کہ کب تک میں زندانِ تنگ سے تیری رہائی کی دعائیں مانگا کروں ۔

تا کے چو صبا بر تو گمارم دم ہمت — کز غنچہ چو گل خرم و خنداں بدر آئی

در تیرہ شب ہجر تو جانم بلب آمد — وقت ست کہ ہمچو مہ تاباں بدر آئی

جاں میدہم از حسرت آں لعل روان بخش — باشد کہ چو خورشید درخشاں بدر آئی

آئندہ شعر میں شہزادے کو شراب سے روگرداں ہونے کی تاکید و نصیحت نکلتی ہو فرماتے ہیں کہ سکندر نے تشنہ لبی کو ترجیح دی تھی تو بھی اُس کی پیروی کر ۔

شاید کہ بآبے فلکت دست نگیرد — گر تشنہ لب از چشمۂ حیواں بدر آئی

اِس شعر میں بادشاہ سے بھی التجا و خوشامد ہے کہ شاہزادے کو رہا کر دے ۔

در خانۂ غم چند نشینی بملامت — وقت است کہ از دولت سلطاں بدر آئی

حافظ مکن اندیشہ کہ آن یوسف مصری
باز آید و از کلبۂ احزاں بدر آئی

شجاع کا نظر بند و قید ہونا تو تاریخ سے بھی ثابت ہے حافظ صاحب کا بھی محزوج و بدرہونا

اس غزل سے مترشح ہوتا ہے حافظ صاحب شاید شہزادے سے جدا اور شہر بدر کیے جاتے ہیں چلتے وقت گلے مل مل کے یہ نوحہ گاتے ہیں :- ؎

ما بر فتیم تو دانی و دل غمخور ما بخت ما تا بکجا می برد آبشخور ما ؟
از نثار مژہ چوں زلف تو در در گیرم قاصدے کز تو سلامے برساند بر ما
بدعا آمدہ ام ہم بدعا دست برار کہ وفا با تو قرین باد و خدا یاور ما
بسرت گر ہمہ عالم بسرم بخروشند نتواں برد ہوائے تو برون از سر ما
فلک آوارہ بہر سو کندم میدانی رشک می آیدش از صحبت جاں پرور ما
ما ز وصف رخ زیبائے تو تا دم زدایم ورق گل خجل است از ورق دفتر ما

اس میں کچھ شک نہیں کہ شجاع سے متعلق ایسی ایسی حسین غزلیں دیوان میں جابجا پائی جاتی ہیں کہ ورق گل ان سے خجل ہے۔

ہر کہ گوید کہ کجا رفت خدا را حافظ
گو بزاری سفرے کرد و برفت از بر ما

ایک اور غزل کے مطلع سے حضرت کا مخرج ہو کر آوارہ و سرگرداں پھرنا ظاہر ہوتا ہے ؎

صبا بہ لطف بگو آں غزال رعنا را کہ سر بکوہ بیاباں تو دادہ مارا

ممکن ہے کہ یہ دونوں جداگانہ واقعات ہوں اور یہ مخرج و بدر پھرنا کسی اور واقعہ کے سلسلے میں ہو بہر حال حافظ صاحب پر ایک ایسا وقت پڑنا بھی ثابت ہوتا ہے جب کہ بدنام عشق ہو کر آپ نکلتے یا نکالے جاتے ہیں اور آوارہ وطنی اور غریبی میں یہ نوحے گاتے ہیں۔

آگے چل کر تاریخ میں یہ واقعہ یکایک پیش آجاتا ہے کہ مظفر کی سختیوں اور سفاکیوں سے عاجز آکر لوگ شہزادے کو قید خانے سے نکال تخت پر بٹھا دیتے اور مظفر کو قید کر کے اس کی آنکھوں میں سلائی پھیر دیتے ہیں اس رہائی اور اس ہنگامے سے جو اس انقلاب کا باعث ہوا شہزادے کے سلامت اور فتحیاب نکلنے پر خوشی اور مبارک باد کے اشعار سے دیوان بھی خالی نہیں حسن اتفاق سے عید اور یہ فتح سعید توام واقع ہوتی ہیں اور حضرت یہ تحفۂ مبارک باد شجاع کو ارسال فرماتے ہیں جس میں وہ وعدے بھی جو بادشاہ ہو جانے پر حضرت کے ساتھ سلوک کے شجاع نے کئے تھے یاد دلاتے ہیں۔

ساقیا آمدن عید مبارک بادت　　وان مواعید که کردی نرود از یادت

چشم بد دور کزیں تفرقه خوش باز آوردِ　　طالع نامور و دولت مادر زادت

باپ کے ساتھ جنگ و پیکار میں فتحیاب رہنے کی خوش نصیبی کو "طالع مادر زاد" نہایت مناسب و موزوں کہا گیا ہے ؎

شکر ایزد که ازیں باد خزاں رخنہ نیافت　　بوستان سمن و سرو گل و شمشادت

شجاع کے بادشاہ اور مظفر کے قیدی و معزول ہو جانے پر دختِ رز دشراب کی ممانعت بھی قدرتاً آزاد ہو جاتی ہے یہ لطیفہ بھی ذیل کے شعر میں عجب لطیفہ واقع ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری ہی دعاؤں سے آزاد ہوئے ہو ؎

بر ساں بندگی دخترِ رز گو بدر آئے　　که دم همت ما کرد ز بند آزادت

شجاع کے قدوم فیض لزوم کی خواستگاری کے ساتھ اُسے عیش و عشرت کی دعا دیتے ہیں :- ؎

شادیِ مجلسیاں در قدم و مقدم تست　　جائے غم باد هر آں دل که نخواهد شادت

حافظ از دست مدہ صحبت آں کشتیٔ نوح

ورنہ طوفانِ حوادث ببرد بنیادت

مقطع سے ظاہر ہے کہ حافظ صاحب شجاع کے فریق وطرفدار تھے اِس ہنگامہ میں اُس کی پارٹی کو کشتیٔ نوح تصور فرماتے اور اپنی سلامتی اُس سے وابستہ ہی رہنے میں سمجھتے ہیں۔

القصہ حافظ صاحب نے جو فرمایا تھا کہ ؎

تا چہ بازی رونماید بیذقے خواہیم راند   عرصۂ شطرنج رنداں را مجال شاہ نیست

اُس کو کرکے دکھا دیا اور مظفر کو پیدل مات کھلا کر چھوڑا اور یہ مقولہ بھی آپ کا پورا ہوا کہ ؎

با دُردکشاں ہر کہ در افتاد بر اُفتاد

شجاع کو بادشاہ بنا دینے میں آپ نے کیا چالیں چلیں اِس کا پتہ نہیں چلتا۔ غالباً آپ نے ہی مظفر کو تخت سے اُتارنے کی اسکیم بنائی اور اپنی حکمت عملی و طلاقتِ لسانی سے شجاع کے بھائی محمود اور آلِ مظفر کے دیگر افراد کو شیشے میں اتارنے اور شجاع کا حامی کار بنانے میں نیز مظفری سرداروں کو ہمنوا کرنے میں شجاع کی مدد کی۔

غرض آپ نے کوئی اہم پارٹ اِس ڈرامے میں ضرور کھیلا بلکہ شاید بہت کچھ آپ کی ہی کوشش سے یہ نتیجہ ظہور میں آیا کیونکہ جب بادشاہ ہوکر شجاع نے آپ سے بیوفائی کج ادائی بلکہ دشمنی اختیار کی تو آپ کو اپنا یہ احسان کہو یا خدمت، اشعار میں بار بار جتانے اور اپنے ساتھ جو اُس کے وعدے تھے ان کو یاد دلا دلا کر اُسے شرمانے کی ضرورت پیش آئی۔ قید سے نکل کر تخت پر بیٹھ جانے کی مبارک باد کے ساتھ ہی تنبیہہ کہ ؎

زاں مواعید کہ کردی نرود از یادت"

اور دختر رز پر رکھ کر یہ یاد دہانی کہ ؎

دم ہمت ما کرد ز بند آزادت

یہی مضمون بالفاظ دیگر اس غزل میں بھی موجود ہے اس شکایت کے بعد کہ ؎

ما ز یاراں چشم یاری داشتیم — خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم
شیوۂ چشمت فریب جنگ داشت — ما غلط کردیم و صلح انگاشتیم
گفتگو آئین درویشی نبود — ورنہ با تو ماجراہا داشتیم

آپ فرماتے ہیں ؎

گلبن حسنت نہ خود شد دلفریب — ما دم ہمت برو بگماشتیم

اور ایک غزل میں یاد دلاتے ؎

زاں یار دلنوازم شکریست با شکایت — گر نکتہ دان عشقی خوش بشنو ایں حکایت
بے مزد بود و منت ہر خدمتے کہ کردم — یا رب مباد کس را مخدوم بی رعایت

یہ بیت بھی اسی فریب خوردگی کی شکایت ہے ؎

گر از سلطان طمع کردم خطا بود — ور از دلبر وفا جستم جفا کرد

شجاع کے حاشیہ نشینوں کے ذریعہ اپنے حقوق جتاتے ہیں ؎

معاشران ز حریف شبانہ یاد آرید — حقوق بندگی مخلصانہ یاد آرید
چو در میان مراد آورید دست امید — ز عہد صحبت ما در میانہ یاد آرید
بوقت مرحمت اے ساکنان صدر جلال — ز روے حافظ و ایں آستانہ یاد آرید

اور ایک غزل میں اسی لہجہ میں یاد دہانی کی ہے ؎

روز وصل دوستداراں یاد باد — یاد باد آں روزگاراں یاد باد
ایں زماں در کس وفاداری نماند — زاں وفاداری یاراں یاد باد
من کہ در تدبیر غم بے چارہ ام — چارۂ آں غم گساراں یاد باد
مبتلا گشتم دریں دام بلا — کوشش آں حق گزاراں یاد باد

آخری دو شعر کے معنی یہاں یہ لیے ہیں کہ ایک وہ وقت تھا کہ تم مبتلائے قید و غم تھے اور ہم غم گساری چارہ سازی، حق گزاری کرتے تھے یا یہ وقت ہو کہ ہم مبتلائے غم و بلا ہیں۔ لازم کہ تم ہماری غم گساری چارہ سازی حق شناسی کرو"

ایک غزل کو شروع ہی اس شکایت کرتے ہیں ؎

جاناں ترا کہ گفت کہ احوال ما مپرس — بیگانہ گرد و قصۂ ہیچ آشنا مپرس؟
نقش حقوق خدمت و اخلاص و بندگی — از لوح سینہ محو کن و ماجرا مپرس؟

شجاع سے اتفاقیہ مڈبھیڑ ہو جاتی ہے ایک غزل میں اس ملاقات کا اور اُس کی گفتگو کا ذکر فرمایا ہے دو ایک شعر اُس غزل کے یہ ہیں ؎

شاہ شمشاد قداں خسرو شیریں دہناں — کہ بمژگاں شکند قلب ہمہ صف شکناں
مست بگزشت و نظر بر من درویش انداخت — گفت کاے چشم و چراغ ہمہ شیریں سخناں
کمتر از ذرہ نۂ پست مشو، مہر بورز — تا بخلوت گہ خورشید رسی چرخ زناں

یعنی اے چشم و چراغ ہمہ شیریں سخناں (حافظ)، مہر بورز = مخالفت چھوڑ دے دوستی سیکھ" تاکہ پھر میری خلوت نشینی کے بلند مرتبہ پر فائز و بلند ہو جائے"

جواب میں آپ اُس کی عہد شکنی کو اس مزے سے یاد دلاتے ہیں کہ ایک جوتی سی اس کے منہ پر لگ جاتی ہے فرماتے ہیں ؎

پیر پیمانہ کشِ ما کہ روانش خوش باد — گفت پرہیز کن از صحبتِ پیماں شکناں!

ان سب کنایات و قرائن سے مجموعۂ بالا کلام سے پیدا ہیں یہ بات کافی ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ شجاع کو تخت پر بٹھانے یا جہانگی سازش اور مشوروں میں حافظ صاحب کی کسی قسم کی مدد شامل اور اُس کے بالمقابل شجاع کے آپ سے عہد و پیمان تھے جن کو بادشاہ ہو کر اُس نے بھُلا دیا ہ

دلبر اول بصد امید گرفت از من دل — ظاہرا عہد فرامش نہ کند خلقِ کریم

گرنش صحبت دیرین من از یاد برفت — اے نسیم سحری یاد دہش عہد قدیم

شجاع نے اپنے عہد و پیماں کو بھُلا نہیں دیا تھا بلکہ بہت بیدردی سے توڑ دیا تھا ہ

دیدی کہ یار جز سر جور و ستم نداشت — بشکست عہد ما و ز ہیچ غم نداشت

آپ کا ڈیوڑھی پر آنا بند کر دیا تھا سامنے آنے کی اجازت نہ تھی ہ

بملازمانِ سلطاں کہ رساند ایں دعا را — کہ بشکر پادشاہی ز نظر مراں گدا را

آپ کی طرف سے دل سخت کر لیا تھا ہ

چہ قیامت ست جاناں کہ بعاشقاں نمودی — رخ ہمچو ماہ تاباں دل ہمچو سنگ خارا

غیظ و غضب بے حد بڑھ گیا تھا ہ

دلِ عالمے بسوزی چو عذار بر فروزی — تو ازیں چہ سود داری کہ نمی کنی مدارا

بھڑکانے والے بھی قریب موجود تھے جن کو رقیب دیو سیرت کہا ہے ہ

ز رقیب دیو سیرت بخدائی پناہم — مگر آں شہاب ثاقب مددے کند خدا را

شہاب ثاقب سے بھی مراد شاید حضوریوں میں کوئی مقرب امیر ہوگا جس کی امداد پر آپ کو بھروسہ ہے لفظ شہاب و ثاقب میں اُن کے نام کا اشارہ ہے۔

آپ کو خوف ہو گیا تھا کہ کہیں قتل نہ کرا دے ؎

مژۂ سیاہت ار کرد بخون ما اشارت　　ز فریب او بیندیش و غلط مکن نگارا

آپ کا وظیفہ بند کر دیا تھا جس کے لئے آپ بیتاب تھے جیسے تشنہ پانی کے لئے ؎

بخدا کہ جرعہ دہ تو بحافظ سحر خیز　　کہ دعائے صبحگاہی اثرے کند شمارا

ایک اور غزل سے مترشح ہوتا ہے کہ آپ پر "سرو" نامی کسی معشوقہ بازاری یا مطربۂ درباری سے عشق و ناجائز تعلق کا الزام بھی لگایا گیا ہے۔ اس کا آپ نے وہی جواب دیا ہے جو شجاع کے باپ مظفر کے عہد میں اسی قسم کے الزام کا دے چکے تھے اور ہم اس کا ذکر کر آئے ہیں آپ کے جواب کا اس وقت شعر یہ تھا ؎

مرا در خانہ سروے ہست کاندر سایۂ قدش　　فراغ از سرو بستانی و شمشاد چمن دارم

اس موقع پر جواب بمصرعہ ذیل ہے اپنی زوجہ محترمہ کو پھر شمشاد سایہ پرور (یعنی پردے دار بی بی) کے الفاظ سے ملقب فرمایا ہے ؎

باغ مرا چہ حاجت سرو و صنوبر است　　شمشاد سایہ پرور من از کہ کمتر است

شجاع کو اپنے درپے آزار دیکھ کر کیا بے ساختہ آپ اس سے دریافت فرماتے ہیں ؎

اے نازنیں پسر تو چہ مذہب گرفتہ　　کت خون ما حلال تر از شیر مادر است

اس شعر پر شجاع دانت ہی پیس کر رہ گیا ہوگا! آگے اس سے بھی بڑھ کر جھڑکی بادشاہ کو براہ راست دی ہے فرماتے ہیں جو کچھ تو دیتا ہو بند کر لے خدا رزاق ہے ؎

ما آبروئے فقر و قناعت نمی بریم　　با بادشاہ بگوئے کہ روزی مقدر است

جس مطربہ مغنیہ کو اوپر سرو کہا گیا ہے اس کا اصلی نام یا لقب یا عرف روایتوں میں شاخ نبات بھی مشہور ہے نہایت شوخی سے آپ اس نام کو مقطع میں لاتے ہیں مگر یہ لقب

اپنے قلم کو دیتے ہیں

حافظ چہ طرفہ شاخ نباتیست کلک تو ۔۔۔ کش میوہ دلپذیر تر از شہد و شکر ست

عجب نہیں جو شہد و شکر اس شاخ نبات کی لڑکیوں یا نوچیوں کے نام ہوں مگر یہ تلمیحات اب مردہ ہوگئیں اُن کی تصدیق کون کرسکتا ہے!

شجاع ایک مطلق العنان بادشاہ تھا اور بڑا بہادر اور جری اور فاتح! بچپن سے لڑائیاں لڑتا اور فتوحات کرتا رہا تھا باپ کی وحشت و خونریزی و درندگی کا بھی حصہ اُس کو ملا تھا ایک بار غصے میں اپنے بیٹے کی آنکھیں نکلوا دیں۔ وہ چاہتا تو حافظ صاحب کو قتل کرا دینا کھال کھچوا دینا اُس کے نزدیک کوئی بات نہ تھی مگر ساتھ ہی اُس کے وہ جن معمولی نہ تھا پڑھا لکھا سخن فہم عالم حافظ قرآن و فاضل اور خود شاعر تھا وہ جانتا تھا کہ اگر بےگناہ بے الزام حافظ کو قتل کرا دیا تو یہ اتنا بڑا شاعر اور ایسا برگزیدہ شخص ہے کہ اس کے خون ناحق کا دھبہ میرے نام پر تا قیام قیامت لگا رہیگا۔ لہذا وہ کسی عذر شرعی کی تلاش میں تھا۔ یہ عذر شرعی اُس کو اِس مقطع میں مل گیا ہے

گر مسلمانی ہمیں است کہ حافظ دارد ۔۔۔ وائے گر از پس امروز بود فردائے!

شجاع بھی حافظ قرآن تھا اور حافظ صاحب اکثر مقطعوں میں اپنے تخلص سے اُس کو مخاطب کرنے کی ذوجہت ترکیب سے دل کی بھڑاس نکالتے ہیں یہ مقطع اُس کی ایک مثال ہے علاوہ انکار قیامت پر مشتمل ہونے کے شجاع کے لئے یہ مطلع ایک زہر یہ بھی رکھتا ہے (جس کو وہ خوب سمجھتا تھا) یعنی شجاع کے اسلام پر تعریض اور چوٹ ہے بالفاظ دیگر اس کو خارج از اسلام کافر کہا گیا ہے! بدلہ لینے کے لئے اس مقطع کو محکمہ احتساب کے سپرد کردیا جاتا ہے اور حافظ صاحب روبکاری میں بلائے جاتے ہیں۔ فرد جرم لگ جاتی ہے اور آپ کو صفائی پیش کرنیکا

حکم دیا جاتا ہے۔ آپ فی البدیہہ ایک شعر اور کہہ کر مقطع کو قطع بند اور کلامِ غیر کر دیتے ہیں اور جواب میں قاضی سے فرماتے ہیں کہ پوری غزل آپ کو نہیں پہونچی یہ مقطع اس طرح ہے ؎

این حدیثم چہ خوش آمد کہ سحر گہ می گفت
بر درِ مدرسہ با دف و نے ترسائے

گر مسلمانی ہمین است کہ حافظ دارد
وائے گر از پس امروز بود فردائے

کلامِ غیر یعنی ترسا بچہ کا کلام بنکر مقطع کفر کے دائرہ سے نکل جاتا ہے اور شرع کے اصول یعنی "نقلِ کفر کفر نباشد" کی پناہ میں حافظ صاحب آجاتے ہیں۔ "بر درِ مدرسہ" کے الفاظ سے اشارہ بادشاہ کی طرف بالکل نہیں رہتا۔ کیونکہ مدرسہ حافظ صاحب کا دار الاقامت تھا۔

اِس قضیہ سے رستگاری میں خواجہ قوام الدین (وزیر شاہ شجاع) نے بھی ضروری مدد دی اور بادشاہ کے جوشِ انتقام کو ٹھنڈا کیا۔ حافظ صاحب نے ایک قطعہ اُس کے شکریہ میں اُس کو لکھ کر بھیجا ہے جس کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی آپ پر ایسی بُری بن گئی تھی کہ اِس مہلکہ سے سلامت بچنے پر آپ شادی مناتے ہیں ؎

نہ سکر تہمتِ تکفیر از میاں برخاست
بکوش کز گُلِ وُل داد عیشِ بستانی

بیار بادۂ رنگیں کہ صد حکایت خوش
بگویم و بکنم رخنہ در مُسلمانی

اُن مدعیانِ شرع پر بھی جو اِس تہمتِ تکفیر میں شجاع کے ہم آہنگ تھے ہاتھ صاف کرتے ہیں ؎

بخاکِ پاکِ صبوحی کشاں کہ تا من مست
بکوے میکدہ استادہ ام بدربانی

بہیچ زاہدِ ظاہر پرست ننشستم
کہ زیر خرقہ نہ زنار داشت پنہانی

جفا نہ شیوۂ دیں پروری بود حاشا
ہمہ کرامت و لطف است شرعِ یزدانی

قوام الدین وزیر کا جو اس مہلکہ میں آپ کے آڑے آیا شکریہ ادا کرتے ہیں ؎

قوام دولت دنیا محمد ابن علی | کہ می درخشدش از چہرہ نور یزدانی
سوابق کرمت راچگونہ شرح دہم | تبارک اللہ ازاں کارساز روحانی
صواعق سخطت را اگر نمی تو انم گفت | نعوذ باللہ ازاں فتنہ ہائے طوفانی
تو بودی آں دم صبح امید کز سر مہر | بر آمدی و سر آمد شبان ظلمانی

حافظ صاحب تو اس مہلکہ سے بچ گئے مگر آپ کا کلام نہ بچ سکا جہانگیر کے عہد کی تالیف ایک قلمی تذکرہ میں۔ جو ہم نے کتب خانہ حبیب گنج کی نذر کر دیا تھا اور وہاں غالباً موجود ہوگا یہ سانحہ درج ہے کہ حافظ صاحب جب محکمۂ احتساب میں پکڑے گئے تو ان کی غیبت میں گھر والوں نے اس اندیشے سے کہ مبادا دیوان میں کوئی اور شعر اس قسم کا موجود ہو جس سے تکفیر پر استدلال کیا جا سکے دیوان کے تمام اوراق دھو ڈالے! اگرچہ ان انتخابات سے جو آپ کے کلام کے مروج تھے اور تحفتاً لوگ لیجایا کرتے تھے بہت سا کلام پھر جمع ہو گیا لیکن جو کلیات دھو ڈالا گیا تخمیناً پچاس برس کا مجموعۂ کلام تھا اس میں خدا جانے کیا کیا تلف ہو گیا۔

موجودہ دیوانوں میں ابتدائی کلام کا کوئی نمونہ نہیں ہے۔ یا شاید ہو تو ایک آدھ ہو ورنہ تمام انتخاب ہی انتخاب اور اعلیٰ درجہ کا کلام ہے جس میں مشق ابتدائی ہونے کے کوئی آثار نہیں۔ اگر کوئی کچی یا کم درجہ کی غزل کسی مجموعہ میں پائی جاتی ہے تو اس کو آپ کا کلام سمجھنے میں لوگ تامل کرتے ہیں بعض الحاقی کہتے ہیں۔ چنانچہ سودی وغیرہ آپکا کلام چھانٹنے والوں نے بہت سی غزلیں چھوڑ دی ہیں ہماری رائے میں ان غزلوں میں کئی جو آپ کی نہیں تسلیم کی جاتیں بہت سا کلام آپ کا ہے مثلاً یہ غزل ؎ ترا گر ماہ و خور

گفتیم گفتیم" آپ کے دیوان کے اُن نسخوں میں جو معتبر سمجھے گئے ہیں، نہیں پائی جاتی مگر مقطع بول
رہا ہے کہ صریحًا حافظ کی غزل ہے غیر حافظ کا یہ مقطع ہو ہی نہیں سکتا ؎

اگر زیر و زبر گفتیم گفتیم　　　مرا معذور داری ہمچو حافظ

یعنی زیر و زبر کی غلطی حافظوں سے ہو ہی جایا کرتی ہے" حافظ صاحب کے ابتدائی
کلام کا یہ غزل ایک نمونہ ہے۔

غرض تہمت تکفیر کی سراسیگی میں یہ بہت بڑا نقصان ہو گیا کہ آپ کا پچاس سالہ کلام
دھوڈالا گیا۔ اب جو کچھ ہے وہ اس واقعہ کے بعد کا کلام ہے اسی لئے شجاع کے متعلق
اور اُس کے عہد و مابعد کی تلمیحات اُس میں بکثرت ہیں پہلے کا کلام خال خال ہے

اوپر یہ بیان ہو چکا ہے کہ "بر در مدرسہ با دف و نے ترسائے" والے شعر میں مدرسہ
کا لفظ لاکر حافظ صاحب نے بادشاہ یعنی حافظ شاہ شجاع کو محکمۂ احتساب میں اپنی دار و گیر
کے وقت ؎ "گر مسلمانی ہمین است کہ حافظ دارد" کی زد اور نشانے سے بچا دیا تھا مگر
آپ کی شوخی طبع کب ماننے والی تھی ایک اور غزل کہی جس کے مقطع میں شاہ شجاع کے
عقیدۂ قیامت پر اُلٹا ہاتھ صاف کیا ہے یہ کہہ کر کہ ؎

رحم کن بر دل مجروح خراب حافظ　　　زانکہ ہست از پئے امروز یقیں فردائے

یعنی اگر مجھے نہیں تو تجھے تو پورا پورا اعتقاد قیامت کا ہے پھر مجھ پر کیوں رحم
نہیں کرتا میری دل آزاری پر دل آزاری کیوں کئے جاتا ہے؛ بالفاظ دیگر اگر تجھے قیامت
کا یقین ہوتا تو یہ عہد شکنیاں اور دل آزاریاں نہ کرتا"

شجاع اور حافظ صاحب کے ان مناقشات کا سبب آخر کیا تھا؟

پہلا سبب تو حافظ صاحب کے ساتھ شجاع کے وعدے وعید تھے کہ بادشاہ ہو

وہ اُن کے ساتھ چناں کرے گا اور چنیں کرے گا خلاصہ ان کا یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ سکندر ہوگا اور یہ ارسطو کی جگہ اُس کی وزارت پہ ہوں گے، مگر بادشاہ ہو کر اُس کی نیت پلٹ جاتی ہے یا وعدہ خلافی پر شجاع خود کو مجبور پاتا ہے یعنی اس وعدے کو آپ کی مولویت اور تشرع کی وجہ سے پورا نہیں کر سکتا۔ شاعر نغز گو و خوش گفتار یا مولوی متشرع صوفی عالم وغیرہ ہونا اور بات ہے اور مہمات سلطنت کی سنبھال کی قابلیت اور شے ہے اس کے لئے دنیادار ہی زیادہ موزوں ہو سکتے ہیں جو مصلحت کے موقعوں پر جھوٹ، ظلم، ناانصافی قتل کسی چیز سے دریغ نہ کر سکیں حافظ صاحب سے یہ چیز کوسوں دُور تھی۔ دوسری وجہ یہ قیاس کی جا سکتی ہے کہ بادشاہ ہونے کے بعد قدرتاً طبیعت آرام طلب عیش پسند ہو جاتی ہے بادشاہ کا دل ایسے قوت بازو وزیر کا متمنی ہوتا ہے جو مہمات جنگی میں بھی اُس کی طرف سے سپہ سالاری کر کے اُس کی زحمت بچائے۔ شجاع کے جو وزیر ہوئے ان میں یہ اوصاف موجود تھے وہ اُس کی لڑائیاں لڑتے اُس کے لئے فتوحات کرتے اور معرکوں میں اُس کی ذاتی زحمت کو بچاتے تھے۔ حافظ صاحب بھی اپنے ذیل کے شعر میں سپہ گری کا اور سپاہی ہونے کا دعوے بھی فرماتے ہیں ؎

دشمن ہزار باشد اگر یار با من است — دائم مصاف را و نترسم ز کارزار

ضرور آپ نے فنون حرب و ضرب کو بھی سیکھا ہوگا جو ہر مسلمان نوجوان کی تعلیم کا جز ہوتے تھے بایں ہمہ آپ بہت کمزور دل کے شخص تھے مثلاً

ہندوستان آنے کے لئے جہاز میں بیٹھ گئے لیکن جہاز کو موجوں میں ڈگر مگر ہوتے دیکھ فوراً اتر پڑے سفر کا ارادہ ہی ترک کر دیا اور یہ شعر زیب رقم فرمایا ؎

بس آساں می‌نمود اوّل غم دریا ببوئے سود — غلط گفتم کہ ہر موجش بصد گوہر نمی ارزد

خشکی کے سفر میں بھی آپ کا یہی حال تھا کہ زحمت سے گھبراتے تھے بلکہ عہد کرتے تھے کہ آئندہ کبھی سفر میں قدم نہ رکھوں گا ؎

گر ازیں منزلِ غربت بسوئے خانہ روم ۔۔۔ نذر کردم کہ ہم از راہ بہ میخانہ روم
زیں سفر گر بسلامت بوطن باز رسم ۔۔۔ دگر آنجا کہ روم عاقل و فرزانہ روم
تا بگویم کہ چہ کشفم شد ازیں سیر سلوک ۔۔۔ بر درِ میکدہ با بربط و پیمانہ روم
بعد ازیں دستِ من و زلفِ چو زنجیرِ نگار ۔۔۔ تا بکے از پئے کامِ دلِ دیوانہ روم

خرم آں روز کہ حافظ بتولائے وزیر
سرخوش از میکدہ با دوست بکاشانہ روم

مقطع سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مہم میں حضرت بھی ساتھ ہوتے ہیں مگر دشتِ غربت اور سفر کی زحمت سے نالاں و پریشان ہیں وزیر سے ملتجی ہیں کہ بدرقہ ساتھ کرکے اُن کو واپس شیراز بھیج دے۔

ذیل کی غزل میں بھی جو ممکن ہے کسی دوسرے موقع کی ہو، پھر اسی غربت و زحمت کی نالش و فریاد اور اُس سے نجات دلانے کی وزیر سے درخواست ہے ؎

خرم آں روز کزیں منزلِ ویراں بروم ۔۔۔ راحتِ جاں طلبم و زپئے جاناں بروم
گرچہ دانم کہ بجائے نبرد راہِ غریب ۔۔۔ من ببوئے خوشِ آں زلفِ پریشاں بروم
چوں صبا با دلِ بیمار و تنِ بے طاقت ۔۔۔ بہوا داریِ آں سروِ خراماں بروم
نذر کردم کہ گریں غم بسر آید روزے ۔۔۔ تا درِ میکدہ شادان و غزلخواں بروم

ور چو حافظ نبرم رہ ز بیاباں بیروں
ہمرۂ کوکبۂ آصفِ دوراں بروم

بڑھاپے کی ایک غزل میں فرماتے ہیں کہ میں نے کبھی سفر پسند نہیں کیا ؎

من از وطن سفر نگزیدم بعمر خویش   در عشق دیدن تو ہوا خواہ غربتم

سفر میں تکلیف و زحمت کے سبب سے نالاں ہونا ایک وجہ قوی رکھتا ہے لیکن آپ تو پردیس کے آرام میں بھی رو دیئے ہیں ؎

نماز شام غریباں چو گریہ آغازم   بمو یہ ہائے غریبانہ قصہ پردازم

بیاد یار و دیار آنچناں بگریم زار   کہ از جہاں رہ و رسم سفر براندازم

من از دیار حبیبم نہ از بلاد رقیب   مہیمنا برفیقان خود رساں بازم

بجز صبا و شمالم نمی شناسد کس   عزیز من کہ بجز باد نیست ہمرازم

ہوائے منزل یار آب زندگانی ماست   صبا بیار نسیمے ز خاک شیرازم

الحق کہ یہ پودا پن میر لشکری و سر عسکری و سپہ سالاری کے لئے کسی طرح موزوں متصور نہیں ہو سکتا۔

تیسری وجہ شجاع کے آپ کے ساتھ خلاف وعدگی کرنے کی آپ کی درویشی بزرگی اور ثقاہت تھی بادشاہ ہونے کے بعد جوان بیٹا شجاع عیش کی طرف مائل اور حافظ صاحب جیسا کہ اُن کے کلام سے ظاہر ہے فن نصیحت گری میں حضرت شیخ سعدیؒ سے بھی زیادہ طاق و چُست - دونوں کی نبھ کیسے سکتی تھی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ پہلی ہی غزل جو آپ نے شجاع کے تخت نشین ہونے پر بجائے قصیدہ لکھی اُس میں نصیحت شروع ہو گئی ہے شجاع کو عبرت دلاتے ہیں کہ کہاں گیا تیرا باپ جو شراب کی ممانعت کیا کرتا تھا اور سماع کی بھی اجازت نہ دیتا تھا ؟

چنگ در غلغلہ آمد کہ کجا شد منکر   جام در قہقہہ آمد کہ کجا شد مناع

وضع دوراں بنگر ساغرِ عشرت برگیر　　　　که بهر حال همین ست بهین اوضاع

طرّۂ شاہدِ دنیا ہمہ مکرست و فریب　　　　عارفاں بر سرِ ایں نکتہ نجویند نزاع

پہلے شعر کا مدعا یہ ہو کہ باپ کی طرح جبّار و قہّار تُو نہ ہونا، دنیا میں جبّاروں قہّاروں کی ذراسی دیر میں خاک اُڑجاتی ہے اور پتہ باقی نہیں رہتا۔ دوسرے شعر میں عیش پرستی سے بچنے کی بانداز معکوس نصیحت پیدا ہے اور یہ آپ کا خاص اندازِ نصیحت ہے جس چیز سے منع کرنا ہوتا ہے اُس کی غلط تعریف کرکے خود مخاطب کے دل میں اعتراض و شبہ پیدا کر دیتے ہیں اِس شعر میں ساغرِ عشرت کو بہین (بہترین) اوضاع کہہ کر یہ شبہ پیدا کیا گیا ہے۔ تیسرے شعر میں امن و آشتی کی بے کھٹکے زندگی بسر کرنے کی ہدایت ہو بالفاظ دیگر شجاع کو ہمسایوں خصوصًا بھائیوں سے لڑنے بھڑنے مخاصمت رکھنے سے روکا گیا ہو

یہ سب نصیحتیں گو بہت اچھی اور قیمتی ہیں لیکن شاہانہ اولوالعزمیاں اور ریاسی ضرورتیں ایسی باتوں کو نہیں سُن سکتے۔

چوتھی اور سب سے بڑی وجہ مناقشہ کی یہ ہوتی ہے کہ شجاع جو اپنے باپ کی ممانعت شراب کی سختی اور تشدد کا خود زخم خوردہ تھا اُس ممانعت کو یک لخت اُٹھا دیتا ہے۔ حافظ صاحب کو ممانعت کی برطرفی اور شراب کے علی الاعلان فروخت و استعمال کی اجازت ہو جانے پر پھر شوخ شوخ مضامین اپنے اشعار کے لئے ہاتھ آتے ہیں یاروں کو خبر دیتے ہیں ؎

دوستاں دخترِ رز توبہ ز مستوری کرد　　　　رفت بر محتسب و کار بدستوری کرد

آمد از پردہ بمجلس عرقش پاک کنید　　　　تا نگویند حریفاں کہ چرا دوری کرد

یعنی پردے سے جو وہ پردہ نشین نکالی گئی تو مارے شرم کے پسینے پسینے ہو۔ عرق

اُس کا پوچھیں پاک کریں اور اس سوال سے اُس دوشیزہ کو شرمندہ نہ کریں کہ اتنی مدت کہاں بھاگی رہی بلکہ ؎

جائے آنست کہ در عقد وصالش گیرند　　دختر رز کہ بکنج ایں ہمہ مستوری کرد

نکاح سے پہلے دوشیزاؤں کی طرح کئی سال (عہد مظفری میں) مستورہ چکی اب اُس سے عقد مناکحت ہوجانا چاہیئے کہ آخرتا کجا! ساتھ ہی سرود و سماع کی بھی ممانعت اُٹھ گئی ہائے و ہو سے محفلیں پھر گونجنے لگیں مطربوں کو استحقاق انعام اور ہیل بٹوں کا حاصل ہوا۔ ؎

مژدگانی بدہ اے دل کہ دگر مطرب عشق　　راہ مستانہ زد و چارۂ مخموری کرد

شاہ شجاع کو بادہ پرور اور مے نواز دیکھ کر وہ اہل دنیا جو اُس کے باپ کو زاہد و متقی پاکر اُس کے ہم صورت زاہد خشک بن گئے تھے شجاع کی خوشنودی کے لئے واپس اپنے رنگ میں آجاتے ہیں اور اپنے گذشتہ اعمال کو شراب سے دھونے لگتے ہیں تاکہ رنگین مزاج بادشاہ اُن کو زاہد خشک نہ سمجھے اپنا ہمرنگ جانے اس لئے خوب ہی کھل کھیلتے ہیں حافظ صاحب لباس شرع کی اس توہین پر افسوس کے آنسو بہاکر فرماتے ہیں ؎

نہ بہفت آب کہ رنگش نہ بآتش برود　　آنچہ با خرقۂ زاہد مے انگوری کرد!

صاحب شعرالعجم کے یہ غزل نظر نہیں پڑی ورنہ اس کو بھی شراب کی ممانعت اُٹھ جانے کا شادیانہ ہی قرار دیتے اور حافظ صاحب کی شادمانی کی ایک اور سند پیش کرسکتے ؎

تعجب ہے سمجھ پر آپ کی سمجھے تو کیا سمجھے!

ملک میں اُسوقت ضرور ایک طبقہ جیسا کہ ہونا چاہیئے تھا شراب کی ممانعت اُٹھا دینے پر معترض اور اُس کا مخالف موجود تھا اُس کے شور مخالفت کو دبانے کے لئے شجاع دلائل عقلی اور نقلی سے کام لیتا ہے۔ عقلی دلائل میں یہ وجہ سب سے قوی تھی کہ شراب

کی بندی سے ملکی محاصل میں سخت کمی واقع ہوگئی تھی خزانہ مفلس تھا اور شجاع کو اپنے حوصلوں اور ارادوں کو پورا کرنے خصوصاً بھائیوں کی معرکہ آرائیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے روپے کی بے انتہا ضرورت تھی۔ آبکاری کی آمدنی بہت بڑی اور نقد آمدنی ہوتی ہے خزانے پر ممانعت شراب کا چند سال میں بہت بُرا اثر پڑا ہو تو تعجب نہیں۔

دلائل نقلی یعنی شرعی حیلے خود شجاع نے بھی تراشے کہ علوم دینی میں دستگاہ و قابلیت کا مدعی تھا ایسے علما کی بھی کسی زمانے میں کمی نہیں رہی جو حاکمانِ وقت کی خوشنودی کے لئے جس قسم کے فتوے مطلوب ہوں گھڑ دینے میں کمال رکھتے ہیں۔

بنے ہوئے صوفیوں کے طبقے نے بھی نہ صرف بادشاہ کی ہاں میں ہاں ملائی بلکہ شاید شراب خوری کرتے ہوئے پکڑے گئے مگر شجاع نے بظاہر اس عذر سے انھیں معاف کر دیا کہ یہ اللہ والے لوگ ہیں لہو و لعب کے لئے نہیں بلکہ یادِ الٰہی میں مست رہنے کے لئے چسکی لگا لیتے ہیں!

اس معافی سے حافظ صاحب کو اپنے اشعار کے لئے بعض نہایت ہی ظریف مضامین ہاتھ لگے ہیں مثلاً ؎

شراب نوش کُن و جامِ زر بحافظ دہ　　　　که بادشاہ زکرم جرمِ صوفیاں بخشید

"جامِ زر بحافظ دہ" سے مراد یہ بھی ہے کہ نگہبان کے حوالے کر کیونکہ صوفیوں کے جرم کی پرسش نہیں رہی مبادا وہ چرا لیں" ایک اور مطلع ہے ؎

صوفی گلے بچیں و مرقع بخار بخش　　　　ایں زہدِ خشک را بمئے خوشگوار بخش

یہ مطلع بھی اسی عنوان سے متعلق ہے

ساقی ار بادہ ازیں دست بجام اندازد　　　　صوفیاں را ہمہ در شرب مدام اندازد

اِس مقطع میں بھی یہی شوخی و ظرافت ہے ؎

عجب میداشتم دیشب ز حافظ جام و پیمانہ — مگر منعش نمی کردم کہ صوفی وار می آوردا

شاید یہ معافی لوگوں کے لئے ایک لائسنس ہو گئی تھی اکثر مسلمان کسی نہ کسی پیر کے مرید اور یک نہ ایک زمرۂ صوفیہ کے پیرو ہوتے تھے۔ بہت لوگوں نے اِس پناہ کی آڑ میں تقوے توڑ دئے ہوں گے اور محتسب کے قبضے سے نکل گئے ہوں گے آخر نوبت بانیجا رسید کہ حافظ صاحب کو یہ غزل لکھ کر بادشاہ کو اِس حالت کی طرف توجہ دلانی پڑی جو اُس کی معافی اور چشم پوشی کی بدولت حدِ اعتدال سے تجاوز کر گئی تھی ؎

در عہد بادشاہ خطا بخش و جرم پوش — حافظ قرابہ کش شد و مفتی پیالہ نوش

صوفی ز کنج صومعہ در پائے خم نشست — تا دید محتسب کہ سبو می کشد بدوش

احوال شیخ و قاضی و شرب الیہود شاں — کردم سوال صبحدم از پیر مے فروش

گفتا نگفتنی ست سخن گرچہ محرمی — درکش زبان و پردہ نگہدار و می بنوش

اے بادشاہ صورت و معنی کہ مثل تو — نادیدہ ہیچ دیدہ و نشنیدہ ہیچ گوش

یہ شعر اور خصوصاً اور اوپر کے سب اشعار بادشاہ کی ہجوِ ملیح ہیں حافظ صاحب کو خود بھی اپنی اِس منہ زوری کا احساس ہوتا ہے فوراً اپنے تئیں خود ڈانٹ لیتے ہیں تاکہ بادشاہ کو غصہ نہ آنے پائے یا ہلکا پڑ جائے ؎

تا چند ہمچو شمع زباں آوری کنی — پروانۂ مراد رسید اے محب خموش

مقطع میں اِس حالت پر غیرتِ دینی سے جو غم و غصہ آپ کو ہے اُس پر دل کو تلقینِ صبر دیتے ہیں ؎

دیشب ندا ز غیب بگوشِ دلم رسید — حافظ تو غصہ کم کن و بنشیں و می بنوش

بنشیں کے لفظ سے آپ کی وہ بڑھی بکتی ہے جسمیں آدمی مارے غصہ کے کھڑا ہوجاتا ہی ؛
شجاع کو بہت سی جنگوں کا سامنا تھا جن کے لیے اُسے شراب کے محصول سے آمدنی
بڑھا کر اپنے خزانہ کی توفیر مطلوب تھی حافظ صاحب کی اِس شکایت کو اُس نے ایک
کان سُنا دوسرے کان اُڑا دیا۔ شراب کی زیادتی ترقی کرتی رہی اور حالت بد سے بدتر
ہونے لگی۔ آپ کو اِس حالت پر واقعی غم و غصہ تھا جیسا کہ مقطع مندرجہ بالا سے بخوبی
واضح ہے۔ ذیل کے مقطع سے اِس بارے میں مکرر آپ کا دلی رنج ٹپکتا ہی ؎

جاں رفت در سرِ مے و حافظ ز غصہ سوخت عیسیٰ دمے کجاست کہ احیائے ما کند

یعنی آپ نے شراب کی اِس بیدریغ اجازت اور کثرت کو اسلامی سوسائٹی کی
دائمی موت سمجھ لیا تھا عیسیٰ دمے سے مراد آنحضرت صلعم کی ذات بابرکات ہی جن کے
عہدِ نبوت میں شراب حرام ہوئی حافظ صاحب نوحہ کرتے ہیں کہ نہ حضرت دنیا میں اب
تشریف لائیں گے (کہ از سرِ نو شراب کو حرام کریں) اور نہ ہمارا احیا ہوسکیگا ؛

حافظ صاحب کا اندیشہ غلط نہیں تھا ایران میں اُسوقت سے جو شراب کی آن
ٹوٹی تو ایسی ہی کہ شیر مادر ہوگئی، شراب و غزل انہی دو چیزوں سے ایران منسوب اور
انہی کے لئے مشہور رہ گیا اور آخر ایران کو زوال کے گھاٹ اُتار ہی کر چھوڑا۔

مسلمانوں میں سے شراب کی آن اُٹھ جانے اور ٹوٹ جانے کو حضرت دین اسلام
کی تباہی کا پیش خیمہ سمجھتے تھے ؎

عقلم از خانہ بدر رفت و گرمے این است دیدم از پیش کہ در خانۂ دینم چہ شود

یعنی اگر شراب کی یہی گرم بازاری رہی تو دکھائی دے رہا ہے کہ عقل تو زائل
ہو ہی چکی دین کی خرابی بھی عنقریب ہونے ہی والی ہے۔

یہ شعر بھی میخواری کی لوگوں میں کثرت پر دال ہے ؎

چناں بزد رہ اسلام غمزۂ ساقی — کہ اجتناب ز صہبا مگر صہیب کند

اِس شعر میں ساقی سے شاہ شجاع اور غمزہ اُس کا حکم آزادی شراب مراد ہے

القصہ آپ نے پھر دوبارہ ایک غزل لکھی کہ غزل ہی آپ کا ہتھیار اور آلہ کار تھا

اِس غزل میں مطلع سے ہی منہ زوری شروع ہوگئی ہے شاہ شجاع اور اُس کے عہد

کی شجاعت پر طعن اُڑاتے ہیں کہ وہ اب بیبا کانہ شراب خوری میں منحصر رہ گئی ہے ؎

سحر ز ہاتف غیبم رسید مژدہ بگوش — کہ دورِ شاہ شجاعست مے دلیر بنوش

شد آنکہ اہل نظر بر کنارہ میرفتند — ہزار گونہ سخن در دہان و لب خاموش

یعنی گزر گیا وہ زمانہ (دور مظفری) جبکہ اہل نظر (شراب خوار) کترائے جاتے

تھے اور خون جگر پیا کرتے تھے۔ کچھ چون وچرا نہ کر سکتے تھے۔

بہ بانگ چنگ بگوئیم آں حکایت ہا — کہ از نہفتنِ آں دیگ سینہ میزد جوش

اب ہم ڈنکے کی چوٹ وہ باتیں کر سکتے ہیں جن کو زبان پہ لانا جرم تھا اور وہ دیگ

سینہ ہی میں پڑی جوش مارا کرتی تھیں۔

شراب خانگی از بیم محتسب خوردن — بہ ساز و چنگ بنوشیم بہ بانگ نوشانوش

اب اِس کی ضرورت نہیں رہی کہ محتسب کے خوف سے شراب چھپ کے پئیں گھر

میں کشید کیا کریں، ڈھول بجا کر جلسے منعقد کر کے خوب علی الاعلان پی سکتے ہیں بلکہ

نوبت بانیجا رسیدہ است امام شہر تک کا یہ حال ہے کہ ؎

ز کوئے میکدہ دوشش بدوش میبردند — امام شہر کہ سجادہ می کشید بدوش!

مگر سوال یہ تھا کہ بادشاہ کرے تو کیا کرے؟ باپ نے شراب کی شدید ممانعت کی

وہ پسند نہ کی گئی اس لئے وہ ممانعت اُٹھا دی تو اُس کو بھی بُرا کہا جا رہا ہے؟ آئندہ شعر میں حافظ صاحب اس سوال کا جواب دیتے ہیں کہ اعتدال کی راہ اختیار کرو خیر الامور اوسطہا[۵]

دلا دلالت خیرت کُنم براہ نجات؟ مکن بفسق مباہات و زہد ہم مفروش

یعنی کھلم کُھلا مونچھوں پر تاؤ دے کر شراب خواری کرنے کو بند کرو مع ہذا اتنی سختی اور شدت بھی نہ کرو جتنی کہ تمہارے باپ کے وقت میں تھی کہ وہ زہد فروشی میں داخل ہے۔"

یہ لڑائی بادشاہ سے لڑ کر اور نصیحت و ہدایت کا فرض ادا کر کے مقطع میں آپ پھر اپنا فقیری کا کمبل اوڑھ لپیٹ کر گوشۂ عبادت و ریاضت میں جا بیٹھتے ہیں یہ کہکر کہ[۵]

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

جن لوگوں نے اس مقطع سے حافظ صاحب پر جُبن و بزدلی کا الزام لگایا ہو اُن کو گریبان میں مُنہ ڈالنا چاہیے شیر کے مُنہ میں ہاتھ دیدینے اور ایک درندے سے کشتی لڑکر اپنی جگہ پر سلامت آ بیٹھنے کا نام جُبن و بزدلی نہیں ہے۔ نہ اس مقطع میں کوئی تعلیم بزدلی کی ہے اس کی تشریح ہم پہلے کر آئے ہیں۔

حافظ صاحب نے جو ہدایت شجاع کو کی وہ عین شرع کے مطابق تھی اسی پر قدیم ایران اور ان ممالک اسلامی میں عمل تھا جہاں مسلمانوں کے ساتھ دیگر مذاہب کے لوگ بھی آباد تھے جن کے مذہب یا معاشرت میں شراب جائز چیز تھی۔ یہ لوگ شہر کے باہر اپنے کلال خانے اور بھٹیاں رکھ سکتے تھے اور بہر حال کسی کے گھر میں گھس کر محتسب کو شراب کی گرید اور شراب خواروں کی زد و کوب کرنے کا اختیار نہ تھا یہ فقہی مثل کہ محتسب را درون خانہ چہ کار؟ اس کی گواہ ہے۔

مظفر کی یہ شدت تھی کہ اُس نے شراب کی کشید اور کلال خانوں کو قطعاً بند کر دیا

اور اُس کے محتسب گھروں میں گھس گھس کر شراب کی کریدا اور شرابیوں کو گرما گرم کرتے تھے۔ برخلاف اِس کے شجاع کی یہ لینت بھی ایک بدعت تھی کہ شراب خواری پر سے تمام بندشیں یک لخت اُٹھا دیں یا اُن سے چشم پوشی کر کے عام لائسنس دیدیا۔

مظفر پر حافظ صاحب کا کوئی زور نہ تھا اُس کے احکام کی صرف ہجو اور ہنسی اُڑانے پر آپ نے اکتفا کیا یہ بھی بہت بڑی دلیری تھی عجب نہ تھا کہ وہ درندہ چڑھ چڑا کر آپ کو پھاڑ بیٹھتا، شجاع پر البتہ آپ کو حقِ دوستی کا زور تھا۔ اس سے آپ نے اُس کے اس رویہ پر صاف صاف احتجاج کئے جن کو خاموش کرنے کے لئے شجاع نے اوّل اُسی ترکیب سے کام لینا چاہا جس کو دیگر علما، و مخالفین کے ساتھ عمل میں لاکر انہیں خاموش اور اپنے احکام شراب کا طرفدار بنا لیا تھا یعنی روپے کا لالچ دے کر آپ کو خاموش کرنا چاہا۔ مگر یہ اُس کی غلط فہمی تھی حافظ صاحب نے جاہ و مال کے واسطے بادشاہ کی مخالفت نہیں کی تھی وہ اس لالچ کو اِس طرح ٹھکراتے ہیں ؎

قسم بحشمت و جاہ و جلال شاہ شجاع ۔۔۔ کہ نیست باکسم از بہرِ جاہ و مال نزاع

یعنی میری لڑائی حصول مال و زر کی خاطر ہرگز ہرگز نہیں ہے ؎

بفیض جرعۂ جام تو تشنہ ایم و لے ۔۔۔ نمی کنیم دلیری نمی دہیم صداع!

تیری عنایت یعنی اُس وظیفے کا جو مجھ کو سلطنت سے ملتا ہے میں بے شک حاجتمند ہوں لیکن اُس کے واسطے بھی میں سر چڑھ کر متقاضی نہیں ہوتا۔ میری تمنا صرف یہ ہے کہ ارباب دین اور اہلِ شرع کے اطوار و اوضاع پاک کئے جائیں ؎

خدائے را ہمہ شستشوئے خرقہ کنید ۔۔۔ کہ بوئے خیر نمی بینیم ازیں اوضاع

یہ اوضاع اِس درجہ بگڑ چلے ہیں کہ ؎

ببیں کہ رقص کناں میرود بنالۂ چنگ کسے کہ اذن نمی دادی مر السماع!

دیکھ تو سہی وہی (مولوی مفتی قاضی) جو ہمیں قوالی تک سننے کی اجازت نہیں دیتا تھا آج خود چنگ کی آواز پر ناچتا تھرکتا جارہا ہے۔ شراب پئے مست و متوالا بنا ہوا ہے!

بہ عاشقاں نظرے کن بہ شکر ایں نعمت کہ ما غلام مطیعیم تو بادشاہ مطاع

ہم غریبوں پر اس شکرِ نعمت میں کہ تم کو بادشاہ بنا کر خود غلام مطیع تمہارے بنے رحم و کرم فرماؤ یعنی ہمارے دین میں رخنہ نہ ڈالو!

"بہ شکر ایں نعمت" کے الفاظ میں بقدرِ اشارہ یہ مضمون بھی پیدا ہے کہ شجاع کو بادشاہ بنوانے تخت سلطنت پر متمکن کرنے میں حافظ صاحب کا ہاتھ شامل تھا"

نصیحت خصوصاً بادشاہوں کو اور وہ بھی اُن کے خلاف مقصد و مدعا اچھی نہیں معلوم ہوتی بُرا مانتے ہیں پھر وہ مخاطب اگر مطلق العنان بادشاہ ہو جس کے حکم پر قتل ہوسکتا ہو اور کھال کھچوادی جاسکتی ہو تب تو نصیحت گری بڑی ہی جرآت کا کام ہے! حافظ صاحب نے عین اُسوقت میں جبکہ اس مطلق العنان کا کد یہاں تک بڑھا ہوا ہے کہ وہ آپ کی خوشامد کرتا ہے اور رشوت پیش کر رہا ہے اُس کو ایسی نصیحت کی جو انکار حکم کے علاوہ ملامت سے بھی خالی نہیں تو فی الحقیقت بڑی جان جوکھوں کا کام کیا اسپر قبل اس کے کہ شجاع کچھ کہے یا جھڑکے اُس کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لئے آپ خود اپنے تئیں جھڑک لیتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

بروادیب نصیحت مگو کہ دیگر تو نہ بینیم پس ازیں ہیچگہ بہ کنج و بقاع

یعنی چل بھاگ! بڑا ادب سکھانے والا آیا ہے!! یہاں نصیحت نہ بگھار۔ آیندہ کبھی ان عمارات میں تجھے ہم نہ دیکھیں!!!

مقطع میں گویا بادشاہ کی زبان سے ارباب نشاط کی طرف منہ کرکے فرماتے ہیں ؎

ز زہد حافظ وطامات او ملول شدیم ۔ بساز راگ غزل گوئے بر سرود سماع

یعنی حافظ کی کٹ حجتی اور ملائیت نے دماغ پراگندہ کردیا تلافی کے لئے راگ سے سُریلا دو گانا بجانا شروع کردکہ طبیعت جو زحمت ہوگئی بحال ہو۔

مگر غصہ ٹھنڈا کرنے کے آخری دو شعروں کے باوجود شجاع کو جو غصہ اور رنج اپنی عطا و خوشامد کو ٹھکرا دینے کا ہونا چاہئے تھا وہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ غالباً اُس نے سخت ناراضی کا اظہار کیا۔

حضرت بھی اس سے زیادہ اُس کو ناراض کرنا نہیں چاہتے تھے کہنے کا جو حق تھا اسکو مکرر مکرر ادا کردینے کے بعد اب آپ شجاع کے ساتھ اپنے تعلق اور دوستی کو جس نے اس ردّ و بدل میں بگاڑ کی صورت اختیار کرلی تھی پیوند پارہ کرکے درست کرنے سنبھالنے کی فکریں لگے ناراضی کے باعث یہ دو تھے۔ (۱) عطیے کو ٹھکرانا (۲) خوشامد کو نہ ماننا، ذیل کی غزل لکھ کر آپ گزرانتے ہیں جس میں اُن دونوں باتوں کو اُس خودداری اور لطف و لطافت کے ساتھ ان لینے پر آمادگی کا اظہار فرماتے ہیں جو آپ ہی کا حق ہے بار الزام شجاع ہی پر رہتا ہے فرماتے ہیں ؎

بفرّ دولت گیتی فروز شاہ شجاع ۔ کہ ہست در نظرِ من جہاں حقیر متاع

دنیا بھر کی دولت میری نظر میں حقیر ہے (قرآن شریف میں اس کو قلیل کہا گیا ہے) مجھے تو ایک صراحی اور ایک اچھے ہمنشیں کے سوا اور کچھ دنیا کی دولت سے درکار نہیں کہ اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ درد سر اور پریشانی کا موجب ہے۔

مگوئے وعظ و بجائے بہل کن ایں شفقت ۔ کہ نیست با تو کسے را بہیچ گونہ نزاع

مجھے کچھ نصیحت وغیرہ بھی نہ کیجئے جو عنایت کرنی چاہتے ہوں اُس سب کے بدلے

ایک جام دیدیجئے کہ آپ کے ساتھ کسی طرح کی کوئی لڑائی ہو ہی نہیں سکتی ٥

زمسجدم بخرابات می فرستد عشق   بسر ہمیروم ایجاں نمی کنیم نزاع

تمہاری محبت مسجد سے خرابات کی طرف دھکیلتی ہو۔ دھکیلے کیوں۔ ہم تو خود سے جانے کے لئے تیار ہیں۔ دوسرے مصرعہ کے یہ معنی بھی ہیں کہ :- نزاع کریں تو سر سے نہ مارے جائیں یعنی قتل کر وائے جائیں گے ٥

بس است ورد شبانہ مئ مغانہ بیار   رحیق بادہ رسید اے رفیق توبہ داع

چھوڑو راتوں کی ریاضت اور وظیفوں کو سرود مے منگاؤ رحیق بادہ آپہنچا رفیق تقوے (عمر بھر کے زہد وصلاح) کو رخصت کرو ٥

بیار مے کہ چو خورشید مشعل افروزد   رسد بکلبہ درویش نیز فیض شعاع

لے آؤ شراب (وہ رشوت جو بادشاہ دے رہا تھا) کہ خورشید عالم افروز جب فیض رساں ہو تو فقیر کے اندھیرے گھر میں کیوں نہ کچھ روشنی پہنچے! قبول عطیہ پر رضامندی کا یہ شعر بادشاہ کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے ہے کہ اُس کی عطا کو آپ نے ٹھکرا دیا تھا اس نے یقیناً برا مانا ہی بلکہ ستم ظریفی سے آپ کا وظیفہ مستحقہ بھی بند کر دیا ہو۔ اس کے بعد آپ نہایت حسرت و انکسار کے ساتھ فرماتے ہیں کہ ہنر کی زمانے میں کہیں قدر نہیں دوسرے مجھ میں کوئی ہنر نہیں کہ جس کو لے کر اس کساد بازاری میں کہیں تجارت کے لئے نکل جاؤں۔"

ہنر نمی خرد ایام و غیر ازینم نیست   کجا روم بہ تجارت بایں کساد متاع

یہ شعر انکسار سے ہو۔ اصل معنی جو مخاطب (بادشاہ) سے پوشیدہ نہیں یہ ہیں کہ میں ہنرمند جہاں ہوں کہ جہاں چلا جاؤں گا میری قدر ہوگی مقطع میں بھی چلے جانے کے ارادے کا اسی کہہ کر نے انداز میں بادشاہ کو متنبہ نوٹس دیا گیا ہے ٥

جبین و چہرۂ حافظ خدا جدا مکناد   ز خاک بارگہِ کبریائے شاہ شجاع

اِس کے معنی بھی زبان ادب و آداب میں یہی ہیں کہ جناب کے دروازے کو بندہ اب پوچھتا ہے۔ یہاں سے رخصت ہو جانے پر کمربستہ ہے۔

شجاع کو حافظ صاحب کی یہ بہت بڑی دھمکی تھی اُس زمانے کے فرمانرواؤں سے باہم یہ بحث اور آرزو رہا کرتی تھی کہ نامی نامور اہلِ کمال ان کی زینت دربار رہیں۔ اگر کوئی ناراض و نالاں ہو کر شہر و دربار سے چلا جائے تو یہ اُس بادشاہ کی توہین سے کم نہ تھا۔

شجاع نے اِس کا بہت بُرا مانا گو بظاہر شاہانہ بے پرواہی سے یہ جواب دیا جو دیوان کی ایک غزل کے اِس شعر میں پایا جاتا ہے ؎

ز دست جورِ تو گفتم ز شہر خواہم رفت   بخندہ گُفت برو حافظا کہ پائے تو بست

لیکن یہ دھمکی حافظ صاحب کی اپنی طبیعت کی غلط فہمی پر مبنی تھی کیونکہ آگے چل کر جب انھوں نے عملاً شیراز کو چھوڑنا چاہا تو انہیں معلوم ہوا کہ رُکناباد و مصلّےٰ شیراز کا خوش منظر مقام جس میں نہر رکنا بہتی ہے نہیں جانے دیتے دامنگیر ہوتے ہیں ؎

نمیدہند اجازت مرا بسیر و سفر   نسیم خاک مصلّےٰ و آب رکناباد

مُراد ان دو چیزوں سے مگر شیراز ہے جہاں آپ کا دِل لگ گیا تھا اور رس بس گئے تھے

اِس دھمکی اور اِس غزل سے جس میں شجاع کی مرضی کی متابعت اور مخالفت شراب سے دست برداری کے اقرار انکاری اور انکار اقراری ملے ہوئے غٹ پٹ ہیں اور ایک ایک لفظ و ترکیب میں کئی کئی چٹکیاں موجود ہیں بادشاہ شجاع اور بھی بھڑک جاتا ہے اور (۱) برافروختہ ہو کر آپ کی ڈیوڑھی (یعنی آمد و رفت اور حاضری دربار) اور وظیفہ مسدود کر دیتا ہے (۲) آپ کی نسبت ریاکار ہونے کا گمان ظاہر کرتا ہے جس کے جواب میں آپ فرماتے ہیں ؎

گفتی از حافظ بوئے ریا می آید"   آفریں بر نفست باد کہ خوش بردی بوئے

ایک اور موقع پر خدا کو گواہ کر کے قسم کھا کر یقین دلاتے ہیں کہ ؎

ما نمردانِ ریائیم و حریفانِ نفاق   آنکہ او عالمِ سرّست بدیں حال گواست

مزید برآں یہ بھی فرماتے ہیں ؎

بادہ نوشی کہ درو ہیچ ریائے نبود   بہتر از زہد فروشی کہ درو زور و ریاست

شراب پینے میں کیا مضائقہ ہے ؎

چہ بود گر من و تو چند قدح بادہ خوریم   بادہ از خونِ رزانست نہ از خونِ شماست

ایں نہ عیب است کزیں عیب خلل خواہد بود   ور بود عیب چہ شد؟ مردمِ بے عیب کجاست؟

یہ سب شجاع کو راہی کرنے کے لطیفے ہیں سب سے شوخ تر یہ شعر ہے

چہ ملامت بود آنرا کہ چو من بادہ خورد   ایں نہ عیب است بر عاشق رند و نہ خطاست

ظاہر ہے کہ آپ شراب نہیں پیتے تھے لہذا پہلے مصرعہ کے صحیح ہونے میں شک کیا ہے؛ دوسرے مصرعہ میں خود کو عاشق رند کہا ہے یعنی عاشق شجاع جو رندی کا حامی کار تھا مراد خود آپ۔ یہ کہ تیرے چاہنے والے کے نزدیک یہ کوئی عیب و خطا نہیں ہو سکتی؛ یہاں تک بھی خیریت تھی لیکن اگلے شعر میں ایک شراب کیا سارے گناہ حلال کر دیتے ہیں اور کس زور و شور کے ساتھ ؎

فرض ایزد بگذاریم و بہ کس بد نہ کنیم   وانکہ گویند روا نیست، نہ گوئیم رواست!

پہلے مصرع میں شرط بظاہر نہایت ہلکی سی مگر فی الحقیقت ایسی کڑی لگائی ہے کہ روا ہوتے ہی ہر معصیت پھر ناروا بن جاتی ہے مراد اس شرط سے حقوق اللہ اور حقوق العباد ہیں۔ جو ان کو ادا کرے اس کے لئے سب مباح ہے۔

مقطع میں حافظ سے مراد حافظ شاہ شجاع ہے جو آپ کی آزاردہی پر تل گیا تھا وظیفہ بند کر دیا تھا وغیرہ فرماتے ہیں ؎

بادہ مینوش و میازار تو کس را حافظ
زانکہ آزردن مردم ہمگی جرم و خطاست

بادہ مینوش کو صنعت تجنیس کی رو سے بادہ لے نوش بھی پڑھ سکتے ہیں یعنی مت پی۔

ایک اور غزل میں شجاع کو عفو معافی کی طرف ذیل کے انداز میں توجہ دلاتے ہیں ؎

ہاتفی از گوشۂ میخانہ دوش
گفت بہ بخشند گنہ مے بنوش

یعنی شراب پینے لگ تو بادشاہ تیرے قصور سے درگزرے گا" جواب میں آپ ہی فرماتے ہیں کہ خدا بخشنے والا ہے قرآن میں اُس نے رحمت کے وعدے فرمائے ہیں۔

عفو الٰہی بکند کار خویش
مژدۂ رحمت برساند سروش

عفو خدا بیشتر از جرم ماست
نکتۂ سربستہ نگوئی خموش

اس شعر میں سمجھایا ہے کہ عفو کا مادہ بندوں میں بھی زیادہ ہونا چاہیئے۔

شیراز چھوڑ کر چلے جانے کی دھمکی سے دست برداری اور بادشاہ کے ساتھ دائم وفاداری کا اُن الفاظ میں عہد پیش کرتے ہیں کہ میفروش کے لقب سے نوازتے ہیں ؎

گوش من و حلقۂ گیسوئے یار
روی من و خاک در میفروش

اے ملک العرش مرادش بدہ
وز خطر چشم بدش دار گوش

داور دیں شاہ شجاع آنکہ ہست
روح القدس حلقۂ امرش بگوش

زندی حافظ نہ گناہیست صعب
با کرم بادشہ عیب پوش

عیب پوش کے لفظ میں صوفیوں کی معصیت پر چشم پوشی فرمانے کی طرف جس کا ذکر آچکا ہے، تلمیح ہے فرماتے ہیں اُن کی تو شراب نوشی تک معاف ہو جائے، اور میری پرہیزگاری معاف نہ ہو۔ پکڑی جائے۔ کیا انصاف ہے!

شاہ شجاع کو مَے فروش کا لقب اوپر دے آئے ہیں اب پیرِ مغاں کا خطاب دیتے ہیں ؎

منم کہ گوشۂ خمخانہ خانقاہ منست　　دعائے پیرِ مغاں وردِ صبحگاہِ منست

اپنی مفلسی جتاتے ہیں کہ وظیفہ بند ہے ؎

گرم ترانۂ چنگ و صبوح نیست چہ باک　　نوائے من بسحر آہ عذر خواہِ منست

مرا گدائے تو بودن ز سلطنت خوشتر　　کہ ذلّ جور و جفائے تو عزّ و جاہِ منست

کلاہ دولتِ خسرو کجا بچشم آید　　کہ خاک کوئے شما عزّتِ کلاہِ منست

گناہ گرچہ نہ بود اختیارِ ما حافظ
تو در طریقِ ادب باش و گو گناہِ منست

ان سب اشعار میں بادشاہ کو راضی کرنے کی باتیں ہیں آخر مقطع کا مفہوم یہ ہے کہ اس مخالفت شراب پر میں شرعاً مجبور تھا تاہم بطریقِ ادب معافی چاہتا ہوں اور اقرار جرم کرتا ہوں!

اس تمام غزل کا جس کے یہ چند اشعار ہیں لہجہ بہت عاجزانہ اور مجبورانہ ہے معلوم نہیں کتنا عرصہ وظیفے کو بند ہوئے گزر چکا ہے اخراجات کی طرف سے آپ نہایت تکلیف میں ہیں ہر شعر کے قافیہ سے ایک آہ پیدا ہے۔ لیکن شاعرانہ شوخیوں سے پھر بھی دست بردار نہیں ہیں مطلع ہی میں شجاع کو پیرِ مغاں کا لقب عطا ہو گیا ہے ؎

چھوٹی اسد نہ ہم سے گدائی میں دل لگی

یہ مصرعہ آپ کے حال پر صادق ہے۔ اس سب حالت کے باوجود نوک جھونک کئے جاتے ہیں ملاحظہ ہو یہ شعر جس میں تجارتِ شراب کے منافع پر جو شجاع لے رہا تھا مزاحانہ استدلال ہے اور ساتھ ہی یہ دشنام بھی مستنبط کہ اُسکی عقل جاتی رہی ہے! ؎

بہائے بادہ چوں لعل چیست؟ جوہرِ عقل
بیا کہ سود کسے بُرد کیں تجارت کرد!

بانیٔ خرابات (شجاع) کو دعا دیتے ہیں ؎

مقامِ اصلیٔ ما گوشۂ خرابات است
خداش خیر دہاد آنکہ ایں عمارت کرد

مقامِ اصلی سے مراد گور گڑھا مدفن گر یہاں مراد وہ گڑھا ہے جس میں سوسائٹی کو شراب کی بدولت آخر جا گرنا تھا! ایک اور شعر میں بھی خرابات کے لفظ سے بادشاہ پر چوٹ کی ہے ؎

قدم منہ بخرابات جز بہ شرطِ ادب
کہ ساکنان درش محرمانِ بادشہ اند!

میخواری کی مخالفت سے کانوں پر ہاتھ رکھنے اور انکار وا باجانے کا یہ طنزیہ شعر کس قدر حسرتناک اور بلیغ مزاح ہے ؎

نہ قاضیم نہ محدث نہ محتسب نہ فقیہ
مرا چہ سود کہ منع شراب خوارہ کنم؟

یعنی شراب کی بندک بندا اور پکڑ دھکڑ میں جن لوگوں کے فائدے ہوتے ہیں ہاتھ رنگے جاتے ہیں تنخواہ اور رشوتیں مارتے ہیں میں اُن میں نہیں پھر مجھے کیا فائدہ کہ میں شراب نوشی کی مخالفت کردوں؟ پھر اس مخالفت کا گمان باطل ہے"

ظاہر ہے کہ ان اشعار سے شجاع اور اُس کے احکامِ شراب کی بڑی بھد ہوتی تھی آپ کا کلام لطیف و ظریف مشہور ہونے کی عجیب و غریب قابلیت رکھتا تھا رند و زاہد دونوں

کو اُس میں مزے ملتے تھے آپ کے قلم سے نکلتے ہی لوگوں کی زبانوں پر جاری ہو جاتا تھا۔ محفلوں میں سماع اور نغمے اسی پر رہتے تھے مطربوں کی زبانی شجاع کے کانوں میں بھی پہنچتا ہوگا اور وہ ان مہین مہین چٹکیوں پر جو خاص اُس کے لئے اشعار میں پوشیدہ ہوتی تھیں دانت ہی پیس پیس کر رہ جاتا ہوگا۔ وظیفہ بند تھا اُس کے کھلوانے جاری کرانے کے بھی عجیب عجیب شوخ انداز اشعار میں ہوتے تھے مثلاً نوروز کی مبارک باد کی غزل میں فرماتے ہیں ؎

رسید مژدہ کہ آمد بہار و سبزہ دمید وظیفہ گر برسد مصرفش گل است و نبید

مگر وظیفہ کہاں؟ وہ تو بادشاہ نے بند کر رکھا ہے ؎

من این مرقع رنگیں چو گل بخواہم سوخت کہ پیر بادہ فروشش بجرعہ نخرید

پیر بادہ فروش پھر شجاع کو کہا گیا ہے بجرعہ نخرید سے مراد ٹکے کو نہیں پوچھتا پیر کے لفظ میں ایک لطیفہ یہ پوشیدہ ہے کہ اس عرصہ میں شجاع ایک بزرگ کا مرید ہو گیا ہے اور انھوں نے اُس کو اپنی خلافت بھی عطا فرمائی ہے؛

بادشاہی وظیفہ بند تھا تو خیر اوروں سے ہی کچھ مدد ملتی قرض ہی مل جاتا مگر بادشا کی ناراضی کی وجہ سے سب فرنٹ ہیں قرض و دام بھی میسر نہیں" اس مضمون کو اس شعر میں ادا کیا ہے ؎

چناں کرشمہ ساقی دلم ز دست ببرد کہ با کسے دگرم نیست برگ گفت و شنید

آخر میں کس مزے سے شجاع سے وظیفہ کا تقاضہ فرماتے ہیں ؎

بہار میگزرد دادگسترا دریاب کہ رفت موسم و حافظ ہنوز مے نچشید

مگر ان ہلکے ہلکے تقاضوں سے کچھ کام نہیں نکلتا کچھ اثر نہیں ہوتا اخراجات تنگی

کرتے ہیں حضرت تہیں ستاتی ہیں یہاں تک کہ آپ مضطر ہو جاتے ہیں چیخ چیخ کر تقاضہ کرنے لگتے ہیں ؎

جانا بجا جتے کہ ترا ہست باخدائے — آخر دمے بپرس کہ مارا چہ حاجت است

اے بادشاہِ حسن خدا را بسوختیم — یارے سوال کن کہ گدا را چہ حاجت است

ارباب حاجتیم و زبانِ سوال نیست — در حضرتِ کریم تمنا چہ حاجت است

جامِ جہاں نماست ضمیرِ منیرِ دوست — اظہار احتیاج خود آنجا چہ حاجت است

محتاج جنگ نیست گرت قصد خونِ ماست — چوں رخت از آنِ تست بیغما چہ حاجت است

اے عاشق گدا چو لبِ روح بخش یار — میداندت وظیفہ تقاضا چہ حاجت است

بیچ میں بھانجی مارنے والے بھی ہوتے ہیں ایک شعر میں ان کو بھی یہ کہہ کر جھڑک دیتے ہیں کہ دو ستوں کے درمیان تم بیچ میں آنے والے کون! ؎

اے مدعی برو کہ مرا با تو کار نیست — احباب حاضر اند باعدا چہ حاجت است

ذیل کے شعر میں بادشاہ کو طوفان سے بچانے کی طرف لطیف اشارہ ہے اِس احسان کو اُس نے موتی (سلطنت) کے پا لینے کے بعد بھلا دیا ہے اُس دریا (یعنی حافظ) سے جس نے وہ موتی دلایا بے غم و بے پرواہ ہو بیٹھا ہے مگر اِس کو اپنے اوپر رکھ کر جتاتے ہیں ؎

آں شد کہ بار منتِ ملاح بردمے — گوہر چو دست داد بدریا چہ حاجت است

اس تمام غزل میں کوئی نوکا جھوکی نہیں، سیدھا اور صاف تقاضا وظیفہ کے اجرا کا کیا ہے۔ تاہم نہ یہ غزل نہ اور سینکڑوں اشعار جو شجاع کو لطیفوں سے ہنسانے منانے کے لئے آپ نے لکھے کچھ کارگر نہیں ہوتے ایک عرصے تک آپ مفلسی تنگدستی کی شکایت

کرتے نظر آتے ہیں اور شجاع آپ کی طرف سے بدستور منہ پھیرے ہوئے، زار ہو ہو کر آپ اسکو
اپنے حال پر متوجہ کرتے ہیں ؎

جانا ترا کہ گفت کہ احوالِ ما مپرس — بیگانہ گرد و قصۂ ہیچ آشنا مپرس
نقشِ حقوقِ خدمت و اخلاص بندگی — از لوحِ سینہ محو کن و نامِ ما مپرس
ہیچ آگہی ز عالمِ درویشیش نبود — آنکس کہ با تو گفت کہ درویش را مپرس
آنجا کہ لطفِ شاملِ خلقِ کریمِ تست — جرمِ گذشتہ عفو کن و ماجرا مپرس

ایک اور غزل کے اشعار ہیں ؎

از عدالت نبود دور گرش پرسد حال — بادشاہے کہ بہمسایہ گدائے دارد
محترم دار دلم کین مگسِ قند پرست — تا ہوا خواہِ تو شد فرِّ ہمائے دارد
ستم از غمزہ میاموز کہ در مذہبِ عشق — ہر عمل اجرے و ہر کردہ جزائے دارد
خسروا حافظِ درگاہ نشین فاتحہ خواند
از زبانِ تو تمنائے دعائے د(آمین = قبول)ارد

"ستم از غمزہ میاموز" الخ فقط شاعری سے نہیں کہا ہے بادشاہ آپ کا دشمن ہو رہا تھا اور آپ کو کسی اڑنگے میں پھانس کر سپردِ فوجداری (احتساب) کر دینے کی فکر میں تھا یا کر چکا تھا شعر ذیل سے مترشح ہے ؎

خزینۂ دلِ حافظ بزلف و خال مدہ — کہ کارہائے چنیں حدِّ ہر سیاہے نیست

سیاہ حبشی کو کہتے ہیں کوتوالی عموماً سیاہ فام عفریت منظر شیدیوں کو دیجایا کرتی تھی۔ دہلی میں محمد شاہ کے عہد تک یہ دستور رہا شیدی فولاد خاں کوتوال تھا۔ زلف سے بیڑیاں اور زنجیریں، خال سے احدی (پیادہ کانسٹبل) مراد ہے۔ غرض حافظ صاحب کی کوتوالی

میں گرفتاری در پیش تھی اُسوقت کا یہ شعر ہے اور اسی کے ساتھ کا یہ مشہور ضرب المثل شعر ہے جو آبِ زر سے لکھ کر مرصع چوکھٹے میں لگانے کے قابل ہے ؎

مباش درپئے آزار و ہرچہ خواہی کُن ؛ کہ در شریعتِ ما غیر ازیں گناہے نیست

عقاب جور کشادست بال در ہمہ شہر کمان گوشہ نشینے و تیر آہے نیست

چنیں کہ در ہمہ سو دام راہ می بینم بہ از حمایتِ زلف تو ام پناہے نیست

عدو چو تیغ کشد من سپر بیندازم کہ تیر ما بجز از نالہ و آہے نیست

اس شعر میں حافظ صاحب ایسا کرتے نظر آتے ہیں۔ مطلع اور حسن مطلع بھی بادشاہ کی اس خفگی کو رفع کرنے کی کوشش میں ہے کہ حافظ صاحب نے شیراز چھوڑ کر کہیں اور جانے کا ارادہ کیوں کیا؟ ارادہ سے دست بردار رہ کر فرماتے ہیں ؎

جز آستانِ توام در جہاں پناہے نیست سرِ مرا بجز ایں در حوالہ گاہے نیست

چرا ز کوئے خرابات روئے برتابم کزیں بہم بجہاں ہیچ رسم و راہے نیست

جان پر بنی ہوئی ہے مگر شیراز کو کوئے خرابات کہنے سے قلم باز نہیں رہ سکتا۔

بادشاہ کی طوطا چشمی کی طرف ذیل کے شعر میں کیا حسین اشارہ ہے ؎

غلامِ نرگسِ جماشِ آں سہی سروم کہ از شرابِ غرورش بکس نگاہے نیست

الغرض اس غزل کے مقطع سے کہ ؎ خزینۂ دلِ حافظ بزلف و خال مدہ الخ بخوبی مترشح ہے کہ آپ کے پیچھے مقدمہ لگا دیا گیا تھا اور وارنٹ جاری تھا۔ غالباً یہ وہی مقدمۂ کفر تھا جس کا قصہ ہم اوپر مفصل لکھ آئے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ بادشاہ کا کچھ بس نہ چل سکا حافظ صاحب ناچار بری کر دئیے گئے بادشاہ کو بڑی خفت اور زک نصیب ہوئی اُس کی شرمندگی دُور کرنے کے لئے آپ نے کیا حسین اور نفیس غزل لکھی ہے کہ شعر فارسی میں اپنا

جواب نہیں رکھتی فرماتے ہیں ؎

گر ز دست زلفِ مشکینت خطائے رفت رفت | ور ز ہندوئے شما بر ما جفائے رفت رفت
برقِ عشق ار خرمنِ پشمینہ پوشے سوخت سوخت | جورِ شاہِ کامراں گر بر گدائے رفت رفت
گر دلے از غمزۂ دلدار بارے برد برد | درمیانِ جان و جاناں ماجرائے رفت رفت
در طریقت رنجشِ خاطر نباشد مے بیار | ہر کدورت را کہ بینی چوں صفائے رفت رفت
عشق بازی را تحمل باید اے دل پائے دار | گر بلائے بود بود و گر دیائے رفت رفت
از سخن چیناں ملامت ہا پدید آید و لے | چوں میانِ ہمنشیناں ماجرائے رفت رفت

عیبِ حافظ گو مکن حافظ کہ رفت از خانقاہ
پائے آزاداں چہ بندی گر بجائے رفت رفت

ہم بھی حافظ صاحب اور شاہ شجاع کے مناقشے کے طویل قصے کو جس کی تلمیحات سے آدھے سے زیادہ دیوان بھرا ہوا ہے یہاں پر رفت و گذشت کرتے لیکن۔ اس قدر تفصیل میں ہم زیادہ تر اس لئے پڑے ہیں کہ اس سے حافظ صاحب کا طرزِ ادا روشن ہوتا ہے کہ کس طرح آپ زلف و خال گل و بلبل وغیرہ کے استعارات میں روزمرہ کی باتیں اور پیش آمد واقعات لکھ جاتے ہیں اور غزل کو ہر قسم کے مطالب کے ادا کرنے کا آلہ بنا لیتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ کون سا مضمون ہے جس کے ادا کرنے پر آپ ان استعارات میں قادر نہیں معلوم ہوتے؟ غزل کا ظرف تنگنائے آپ کی خاطر خواہ حد تک وسیع ہو جاتا ہے جب آپ قلم اٹھاتے ہیں غالب کی یہ شکایت ہیچ نظر آتی ہے کہ ؎

بقدرِ ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل | کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے

اوّل تو مرزا نے اپنے یا اپنے عہد کے حالات و واقعات کسی اردو یا فارسی غزل میں

حافظ کی طرح قلب۔ نہیں کہتے ہیں ساری شاعری ہر زندگی قافیہ پیمائی ہے جس طرح میں اس کے قافیوں کے لائق جو مضمون نظر آیا اس کو باندھ دیا خواہ وہ اُن کی روداد یا کوئی امر واقعہ ہو یا نہ ہو، اُس پر غزل کی تنگ ظرفی کی شکایت بھی؟۔ یہ بھی ایک آمدِ سخن ہی بات ہے واقعہ نہیں۔

حافظ صاحب کی کیفیت اِس سے بالکل مختلف ہی۔ آپ ہیں وہ شاعر کہ جو واقعہ آپ پر گزرتا یا پیش نظر آتا ہے آپ کی طبیعت اُسے لطیف و حسین بنا کر غزل کا جامہ پہنا دیتی ہے۔ اور یہ ممکن صرف اِس لئے ہے کہ ہر چیز کو آپ فطرتاً عشق و محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں چنانچہ دعوے کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۳/۴ سے زیادہ دیوان آپ کے خیالات کا آئینہ، جذبات کا ترانہ آپ کی سرگذشت کا دفتر اور عہد کے سوانح کے اشارات سے مملو ہے۔ صدہا اشعار کی تلمیحات اسوقت ناپید ہو گئی ہیں اس کی وجہ سے کلام کا لطف آدھا یعنی صرف رسمی غزلوں کا سا مزہ رہ گیا ہے وہ تلمیحیں جن سے اُس میں لطف در لطف تھے آج ناپید ہیں۔ پھر بھی کس غضب کا لطف ہے کہ ترجمے کے ذریعہ بھی اگر کوئی آشنا ہوتا ہے تو ہونٹ چاٹتا رہ جاتا ہے۔ اُدھر گوئٹے جیسے زبردست شاعر کو بھی موہ لیتا ہے کہ وہ آپ کے دیوان کے نمونے پر دیوان لکھنے بیٹھ جاتا ہے اِدھر تازہ بتازہ نَو بنَو والی غزل کی لے ہی پر گورے ٹامی ناچنے لگتے ہیں اور تازہ بتازہ نو بنو گا گا کر تھرکیاں لیتے ہیں اہلِ ذوق اور صوفیوں کی تو کچھ پوچھو ہی مت۔ قلابازیاں کھاتے اور سر دھنتے ہیں اور کیسے نہ دھنیں جبکہ کلام کا جوش و خروش یہ ہو جیسا کہ اس غزل میں بلا نغمہ و سرود موجود ہے ؎

بیا تا گل بر افشانیم و مے در ساغر اندازیم　　فلک را سقف بشگافیم و طرح دیگر اندازیم

اگر غم لشکر انگیزد کہ خونِ عاشقاں ریزد
من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم

بیا جاناں منور کن ز رویت مجلسِ ما را
کہ بر رویت غزل خوانیم و در پایت سر اندازیم

چو در دست است رودی خوش بزن مطرب سرودی خوش
کہ دست افشاں غزلخوانیم و پاکوباں سر اندازیم

صبا خاکِ وجودِ ما بآں عالی جناب انداز
بود کاں شاہِ خوباں را نظر بر منظر اندازیم

یکی از عقل می لافد دگر طامات می بافد
بیا کیں داوریہا را بہ پیشِ داور اندازیم

بہشتِ عدن گر خواہی بیا با ما بمیخانہ
کہ از پائے خمت یکسر بحوضِ کوثر اندازیم

سخندانی و خوشخوانی نمی ورزند در شیراز
بیا حافظ کہ تا خود را بملکِ دیگر اندازیم

بعض غزلوں سے جو انتہائی شادمانی کی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شجاع سے آپ کی آخر صلح و مصالحت ہوگئی اور ع خدا نے پھر کے کیا خانۂ چمن آباد! از آنجملہ ایک غزل ہے

روزِ ہجراں و شبِ فرقتِ یار آخر شد
زدم ایں فال و گذشت اختر و کار آخر شد

آں ہمہ ناز و تنعم کہ خزاں می فرمود
عاقبت در قدمِ بادِ بہار آخر شد

بعد ازیں نور بآفاق دہیم از دلِ خویش
کہ بخورشید رسیدیم و غبار آخر شد

آں پریشانیِ شبہائے دراز و غمِ دل
ہمہ در سایۂ گیسوئے نگار آخر شد

ساقیا عمر دراز و قدحت پُر مے باد
کہ بسعی تو ام اندوہِ خمار آخر شد

شکرِ ایزد کہ باقبال کلاہ گوشۂ گُل
نخوتِ بادِ دے و شوکتِ خار آخر شد

باورم نیست ز بدعہدیِ ایام ہنوز
قصۂ غصہ کہ از دولتِ یار آخر شد

صبحِ اُمید کہ بد معتکفِ پردۂ غیب
گو بروں آئے کہ کارِ شبِ تار آخر شد

گرچہ آشفتگیِ کارِ من از زلفِ تو بود
حل ایں عقدہ ہم از روئے نگار آخر شد

شکر کاں محنت بے حد و شمار آخر شد   در شمار او چہ نیاورد کسے حافظ را

ایک اور غزل کے مطلع سے بھی حضرت کے کسی کے ساتھ صلح و مصالحت ہو جانے کا مضمون پیدا ہے دوسرے شعر یعنی حسن مطلع سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی بڑے فتنے کے بعد یہ صلح میسر آئی ہے اس کو ؎ "چہ فتنہ بود کہ مشاطہ قضا انگیخت" فرمایا ہے آپ کی زندگی میں شجاع کے ساتھ جو مخالفت باہمی رہی اس سے بڑا فتنہ آپ کے لئے اور کیا ہو سکتا تھا لہذا غزل ذیل کو بھی اسی صلح و مصالحت پر خوشی کا ترانہ سمجھا جا سکتا ہے۔ ہزاروں شکر اس پر ادا کرتے ہیں کہ دوست کو پھر حسب مراد اور اپنا ہمساز و دمساز پایا ؎

ہزار شکر کہ دیدم بکام خویشت باز   ترا بکام خود دیا تو خویش را دمساز
چہ فتنہ بود کہ مشاطہ قضا انگیخت   کہ کرد نرگس مستش سیہ بسرمہ ناز
بدیں سپاس کہ مجلس منور است بدوست   گرت چو شمع جفائے رسد بسوز و بساز
ملالتے کہ بروے من آمد از غم عشق   ز اشک پرس حکایت کہ من نیم غماز

اس طویل استدلال کے بعد جو ان استفسارات سے شروع ہوا تھا کہ حافظ صاحب رند و میخوار تھے یا صوفی پاکباز؟ حسن پرست ناظر حسن تھے کہ بد نظر نظر باز؟ نتیجہ نکالنے کا اب وقت آ گیا ہے پہلے سوال کا نتیجہ خود بخود یہ مترتب ہوتا ہے کہ رند و میخوار ہونے کے بالکل برعکس آپ ایک مدۃ العمر شراب خواری اور شراب کے مسلمانوں میں رواج پانے کے خلاف جہاد میں مصروف رہے اور اس میں یہاں تک غلو کیا کہ ایک مطلق العنان بادشاہ کو اپنا دشمن بنا لیا سخت مصائب اور خطرات میں پڑنے کے علاوہ ان تمام دنیاوی توقعات پر پانی پھیر لیا جو شجاع کے بادشاہ ہو جانے پر آپ کو اس سے ہو سکتی تھیں بادشاہ کو مخالف پا کر اپنے زمانہ بھی آپ سے منہ پھیرے رہے سوائے ایک شخص کے جس کی

تعریف میں آپ نے یہ شعر یادگار چھوڑا ہے ؎

وفا از خواجگانِ شہر با من ، کمالِ دین و دولت بوالوفا کرد!

یہ شعر اسی غزل میں وارد ہوا ہے جس میں شجاع سے توقعات شکستہ ہونے کا نوحہ ہے یعنی ؎

گر از سلطان طمع کردم خطا بود ور از دلبر وفا جستم جفا کرد

شراب کی مخالفت کو آپ نے نہایت لطیف پیرایہ میں "دربانی میخانہ" سے تعبیر فرمایا ہے

اسے آجکل کی زبان میں "پکٹنگ" کہتے ہیں ؎

دارم از لطفِ ازل منزلِ فردوس طمع گرچہ دربانیِ میخانۂ رندان کردم

ایک اور قطعہ بند میں تقسیم غلیظ فرماتے ہیں ؎

بخاکِ پاکِ صبوحی کشاں کہ تا من مست بکوئے میکدہ استادہ ام بدربانی

بہیچ زاہدِ ظاہر پرست ننشستم کہ زیرِ خرقہ نہ زنار داشت پنہانی

ایسی پاک و پاکباز ہستی پر رندی و میخوارگی کا الزام رکھنا یا گمان کرنا نہ صرف تعجب و افسوس کی بات ہے بلکہ معصیت اور آپ کے کلام میں بے بصری کی دلیل۔ صریحاً آپ نے اشعار میں ایک رندِ مست کا بہروپ بھر رکھا ہے جو کوئی اس پر دھوکا کھائے وہ حافظ صاحب کے بیوقوف بنائے میں آتا ہے یا تحقیق کی ٹانگ توڑتا ہے۔ حافظ صاحب پر جو مقالہ صاحب شعرالعجم نے چھوڑا ہے اس کی نسبت ان کے پرستاروں میں سے کسی نے بڑے فخر کے ساتھ اُن کے حالات میں لکھا تھا کہ قلم کے ایک سپاٹے میں لکھتے چلے گئے تھے یہانتک کہ اُس کو تمام کر کے دم لیا اور سُنا کر داد طلب ہوئے کہ کیوں کیسا لکھا ؟ یعنی "حیات حافظ"[۱] سے جو اُنہی دنوں میں شایع ہوئی تھی بڑھ گیا! قلم کی اس روانی اور جھپاکے کیساتھ جو کچھ لکھا جائے اس میں تحقیق حالات اور تفتیش سیرت کے ساتھ انصاف کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ مصنف شعرالعجم نے اگر حضرت خواجہ حافظ پر

۱؎ مولفہ اسلم جیراجپوری

میخواری کا گمان اپنے مقالے میں باقی چھوڑا تو یا تو ان کو یہ متواتر اشعار جو حضرت کی راتوں کی عبادت و ریاضت اور صلاح و تقوے پر صریح دلالت رکھتے ہیں نظر نہیں پڑے یا انھوں نے بقول خود حافظ ؎

مے خور کہ شیخ و حافظ و مفتی و محتسب — چوں نیک بنگری ہمہ تزویر می کنند

حضرت خواجہ حافظ کو نعوذ باللہ ! اس شعر کے مطابق سچ مچ ایک معمولی ریاکار و مکار سمجھا جو تقدس جتانے کے لئے ایسے اشعار بھی دیوان میں رکھ گیا ہے جن کی صداقت کو مگر مولوی شبلی کی حقیقت بیں نظر باور نہیں کر سکتی ! اشعار یہ ہیں ؎

صبح خیزی و سلامت طلبی چوں حافظ — ہر چہ کردم ہمہ از دولت قرآں کردم

حافظا در کنج فقر و خلوت شبہائے تار — تا بود وردت دعا و درس قرآں غم مخور

مرو بخواب کہ حافظ بہ بارگاہ قبول، — ز ورد نیم شب و درس صبحگاہ رسید

؏ گر مسلمانی کم از کافر مباش : ٹریو نامی انگریز جس نے دیوان کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے ضمیمہ حالات میں حافظ صاحب کی انتہائی پاکی طینت بے بہا نیک خصلت تقوے اور طہارت کا قائل ہو بلکہ مداح اور مصنف شعر العجم اُس کے برعکس ؎

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا !

مکر و تزویر سے حضرت اس قدر دور ہیں کہ اس کے متعلق آپ کا یہ قلم توڑ معرکہ کا شعر بہترین گواہ ہے ؎

رنگ تزویر پیش ما نبود، — شیر سرخیم و افعی سیہ ایم

مکرر فرماتے ہیں ؎

ما نہ مردانِ ریائیم و پرستارِ نفاق — عالِم عالَم اسرار بر ایں صدق گواست

ایک اور گروہ ہے یعنی جدید تعلیم یافتوں روشن خیالوں کا گروہ جو باوجود روشن خیالی کی لالٹین ہاتھ میں ہونے کے اسی غلط فہمی اور غلطی کے گڑھے میں گر پڑتا ہے اور حافظ صاحب کی نسبت میخواری کے استدلال میں یہ دلیل لاتا ہے کہ نشہ کی حالتوں اور میخواری کے معاملات کی کلام میں وہ باریک تشریحیں اور تلمیحیں موجود ہیں جن سے ایک میخوار ہی واقف ہو سکتا ہے دوسرا ان کو اس صحت کے ساتھ بیان نہیں کر سکتا" مگر اس استدلال کے ساتھ ہم نے ان حضرات کی زبان سے کوئی شعر اس کی مثال و سند میں نہیں سنا۔ خود ہمیں تمام دیوان کی چھان بین میں کہیں کوئی ایسی بات یا رمز خاص نہ پائی جو علم عام میں نہ ہو۔ میخواروں سے زیادہ الم نشرح اور کسی گروہ کے معاملات و حالات نہیں نشہ و شراب میں رازداری کہاں؟ پھر علی الخصوص عہد شجاع میں ہر طرف میخواروں کے ہجوم اور شراب کی مجلسوں اور میخانوں کی دھوم ادھر حافظ صاحب جیسی اخاذ طبیعت کا ذہین و ذکی شاعر اُن سے نشہ کیحالتیں اور شرابیوں کے محسوسات مخفی رہ کیسے سکتے تھے؟ تاہم اگر کہیں اُن کے کلام میں ایسے خصوصیات موجود ہیں تو اس استدلال کا کیا موقع ہے کہ جب تک شاعر خود میخواری سے آشنا نہ ہو یہ رموز کلام میں ترا وش نہیں کر سکتے؟ شاعر کی تو تعریف ہی یہی ہے کہ وہ باریک سے باریک جذبات و محسوسات کو اپنے ہوں خواہ غیر کے ہو بہو نقل کر سکے جو لوگ حافظ صاحب پر اس دلیل سے اثبات میخواری کرتے ہیں وہ فی الحقیقت اُن کی شاعرانہ قابلیت و ذکاوت سے انکار کرتے ہیں

حافظ صاحب کے اشعار کی سندات سے درایتاً اُن کو آلائشوں سے پاک اور نیک نہاد ثابت کرنے کے بعد اب روایتاً بھی دیکھنا ہے کہ آپ کی نسبت روایت کیا کہتی ہے۔ تمام قدیم و جدید تذکروں میں حافظ صاحب کو ایک بزرگ و ولی مانا گیا ہے اُن کا نام بغیر ان الفاظ کے جو بزرگوں کے نام کیسا تھ لئے جاتے ہیں نہیں لکھا گیا حضرت و خواجہ و

رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ الفاظ آپ کے نام کے اوّل و آخر میں ہم نے آپ کے دیوان کی ایک اُس نقل کے سرورق پر بھی دیکھے جو آپ کی وفات کے چند ہی سال بعد کی تحریر شدہ ہو اور کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن میں دواوین فارسی کی فہرست میں نمبر   درج ہے۔ اس نقل دیوان کے آخر میں ایک رباعی بھی حافظ صاحب کی شان میں کسی کی ہے جس کا مصرعۂ اوّل یہ ہے ؎ رود آور سے محمد حافظ نام" باقی تین مصرعے اسوقت فراموش ہو گئے ہیں مگر مضمون ان کا حافظ صاحب کی اپنے معاصرین میں عام و خاص مقبولیت و احترام پر دال ہے۔

لطائف اشرفی کے حوالے سے جو عنقریب نقل ہوگا ثابت ہے کہ لسان الغیب لقب بھی آپکا آپ کے عہدِ زندگی میں پڑ گیا تھا ایسا معزز لقب کسی رند بدمشرب کو نہیں دیا جا سکتا تھا۔

لطایف اشرفی نام ہے حضرت مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانی قدس سرہٗ کے ملفوظات کا جو آپ کے مرید نظام حاجی غریب الیمنی نے حضرت مخدوم کی حیات میں جمع کر کے حضرت کی نظر اشرف سے گزرانے تھے اور دیباچے میں ادّعا ہے کہ اکثر عین الفاظ مخدوم میں قلمبند ہوئے ہیں۔ اس کتاب کے ایک مطبوعہ نسخے (مطبوعہ مطبع نصرت المطابع دہلی جلد اوّل صفحہ ۱۸ سطر ۱۲) پر یہ ملفوظ نقل ہوا ہے:۔

"حضرت قدوۃ الکبرائے (مخدوم سید اشرف جہانگیرؒ) میفرمودند کہ:۔ خواجہ حافظ شیرازی از مجذوبان درگاہ عالی و محبوبان بارگاہ متعالی است بایں فقیر (حضرت مخدوم) نیاز مندی داشت و مدتے بہم دیگر صحبت داشتیم روزے در گزرگاہ نشستہ بودیم سخن در مراتب اہل معارف و زہد میگزشت، مجذوب شیرازی خواند ؎

ز روئے دوست دلِ دشمناں چہ دریابد — چراغ مردہ کجا شمع آفتاب کجا!

مکرر انہی ملفوظات کے ص ۳۵۳ سطر ۴ سے یہ عبارت منقول ہے:۔

"حضرت قدوۃ الکبریٰ (مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ) میفرمودند کہ چون ببلدۂ شیراز آمدیم و باکابر آن جائے مشرف شدیم پیش از التقاء ایں شعرے (حافظؒ) بما رسیدہ بود۔ ؎

حافظا از معتقدانست گرامی دارش — زانکہ بخشایش بس روح مکرم با اوست

ازینجا دانستہ بودم کہ او اویسی ست، چوں بہم رسیدیم صحبت درمیان ما و او بسیار محرمانہ واقع شد مدتے بہمدیگر در شیراز بودیم ہرچند کہ مجذوبان روزگار و محبوبان کردگار را دیدہ بودیم اما مشرب وے (حافظ رحمۃ) بسیار عالی یافتیم۔ دراں روزگار ہر کرا دانستن نیابت اینان می بود بوے توجہی کرد۔ و اشعار او بسیار معارف نما و حقیقت کشائے واقع شدہ است۔ اکابر روزگار اشعار او را لسان الغیب گفتہ اند بلکہ بزرگے دریں وادی گفتہ است کہ ہیچ دیوانے بہ از دیوان خواجہ حافظ نیست اگر مردے صوفی باشد بشناسد"

حضرت مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانی قدس سرہٗ چشتیہ خاندان کے جس مرتبہ کے بزرگوں میں ہیں محتاج بیان نہیں خواجہ حافظ سے نہ صرف ذاتی ملاقات بلکہ بہمدیگر اخلاص و نیاز مندی و صحبت محرمانہ اِن ملفوظات سے ظاہر و باہر ہے حافظ صاحب کے مرتبہ بزرگی و ولایت و عالی مشربی کی نسبت آپ کی ذاتی تصدیق ایسی شہادت ہے جس کے بعد حافظ صاحب کے متعلق تمام بدگمانوں کے منہ بند اور بدگمانیوں کا سدباب ہو جاتا ہے اور کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی [۱]

---

[۱] لطائف اشرفی سے اِن حوالہ جات کو اقتباس کر کے بہم پہنچانے کی بابتہ راقم اپنے محب مکرم مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی اسسٹنٹ ہوم سکرٹری حیدر آباد دکن کا ممنون و شکرگزار ہے۔ جزاہ اللہ خیر الجزا۔ محمد احتشام الدین عفی عنہ

حافظ صاحب کے ایک نیاز مند و ہم صحبت اور آپ کے جامع کلام مولانا گلندام نے ایک دیباچہ لکھ کر شامل دیوان کیا ہے جو اکثر معتبر اور مکمل نسخہ ہائے قلمی و مطبوعہ کے اوّل میں ضم پایا جاتا ہے اس دیباچے سے بھی حافظ صاحب کے ہی کے اشغال اور صرف اوقات وہی معلوم ہوتے ہیں جو حقیقی علما، دین اور بڑے اولیا، اللہ کے اشغال و اوقات ـ حافظ صاحب کے اپنی حیات میں اپنے کلام کو یکجا جمع و مرتب نہ کر سکنے کے تعلق میں مولانا گلندام لکھتے ہیں :-

"لے محافظت درس قرآن و ملازمت شغل سلطان و تحشیہ کشاف و مصباح و مطالعۂ مطالع و مفتاح و تحصیل قوانین ادب و تجسیس دواوین عرب از جمع ابیات غزلیاتش مانع آمدے و از تدوین اثبات ابیاتش وازع گشتے ـ مسوّد ایں اوراق (گلندام) در درسگاہ مولانا سیدنا استاد البشر قوام الملۃ والدین عبداللہ اعلی اللہ درجاتہٗ فی اعلیٰ علیین، بکرات و مرّات کہ بمذاکرہ رفتے در اثنار محاورہ گفتے کہ ایں فوائد فرائد راہمہ دریک عقدمی باید کشید ....."

جس کسی کو ان ہمعصر کی اس شہادت میں شک ہو اُسے اس دیباچے کے الحاقی اور جعلی ہونے کا کچھ ثبوت دینا چاہیے لیکن ثبوت کہاں ـ نئی روشنی سے ہمقدمی کی دُھن میں وہ اس دیباچے ہی کو حافظ صاحب کے تذکرے میں اُڑا جاتے ہیں ـ مولوی شبلی کے مقالہ حافظ میں اس کا ذکر ہی ندارد ہے !

ایک اور گروہ ہے جو حافظ صاحب کے کلام کے معرفت میں ہونے کا قائل نہیں اس کے نزدیک حافظ صاحب کے کلام کے سطحی اور ظاہری معنی کے علاوہ اور کوئی معنی نہیں لوگ معنی پہنا لیتے ہیں" لیکن آپ کے ہمعصر و ہم صحبت بزرگ اور صوفیائے کرام کے بڑے سرگروہ حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانی قدس سرہٗ کے ملفوظات کے مندرجہ بالا اقتباسات میں اُن کی یہ رائے

بھی آگئی ہے کہ :-

اشعارِ وے (حافظ) بسیار معارف نمائے حقیقت کشائے واقع شدہ است۔ اکابر روزگار وے را لسان الغیب گفتہ اند بلکہ بزرگے دریں وادی گفتہ کہ ہیچ دیوانے بہ از دیوانِ خواجہ حافظ نیست۔ اگر مردے صوفی باشد بشناسد"

خود حافظ صاحب کا بھی دعوٰی یہی فرماتے ہیں ؎ شعر حافظ ہمہ بیت الغزل معرفت است الخ البتہ اس کے سمجھنے کے لئے حسب قول صاحب لطائف اشرفی صوفی ہونا شرط ہے۔ حضرت سید اشرف جہانگیرؒ کے ساتھ ملاقات و گفتگو میں خود حافظ صاحب نے اپنا یہ شعر ؎

زروئے دوستِ دلِ دشمناں چہ دریابد چراغ مردہ کجا شمع آفتاب کجا

ایسے ہی معنی میں پیش کیا ہے جن کو تصوف سے علاقہ ہو۔ دوست سے مراد خدا، دشمنوں سے مراد علمائے ظاہر ہیں جو صوفیوں پر منہ آتے اُن پر کفر کے فتوے لگاتے ہیں۔

حافظ صاحب کی ایک مشہور غزل ہے جو سماع کی محفلوں میں بڑے زور شور سے گائی جاتی ہے مطلع ہی سے وجد و حال شروع ہو جاتے ہیں مطلع یہ ہے ؎

منم کہ گوشۂ میخانہ خانقاہِ منست دعائے پیرِ مغاں وردِ صبحگاہ منست

ظاہر الفاظ کے بموجب یہ مطلع بالکل رندانہ ہو لیکن جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ اس مطلع میں پیرِ مغاں سے مراد (۱) شاہ شجاع ہے جو خلیفہ ایک پیر کا بن کر خود پیر ہو گیا تھا۔ ادھر اُس کے احکام برطرفی ممانعت شراب کے لحاظ سے تمام شرابخانوں کی رونق و گرم بازاری کا بھی موجب و موجد و سرپرست تھا۔ لہٰذا پیرِ مغاں اُس کو طنزاً کہا گیا ہے (۲) پیرِ مغاں کے ایک معنی "سر حلقۂ موحدان وحدت پرستاں" بھی ہیں اس طرح کہ قدیم ایران میں دو گروہ تھے ایک یزداں و اہرمن کو مانتا

تھا۔ دوسرا وحدانیت کا قائل تھا اُس کے مقلد مُغ کہلاتے تھے۔ ان معنی کے لحاظ سے پیرِ مغاں سے پیشوائے موحدان (حضرت نبی آخر الزماں) اور دعائے پیرِ مغاں سے مُدّعا نمازِ صبح اُٹھ کر درود بھیجنے کا شغل۔

یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ پرانی تاریخوں سے کھود کھاد کر یہ معنی ہم نے پیدا کر لئے اور اس شعر کو پہنا دئے ہیں۔ لفظ مُغ کے اصلی معنی سے حافظ صاحب ہم سے زیادہ واقف تھے۔ اُن کے رندانہ کلام میں ایسے ہی لطائف اور باریکیاں مخفی ہیں اور انہی کی بنا پر اُن کو اپنے کلام کے خلافِ شرع نہ ہونے کا پُر زور دعویٰ ہے۔ گویا موچھوں پر تاؤ دے کر فرماتے ہیں ؎

بیار بادۂ رنگیں کہ صد حکایتِ خوش　　بگویم و نکنم رخنہ در مسلمانی!

بادشاہ (شجاع) کے اشارے سے جو فتوائے کفر کا آپ پر لگایا گیا تھا اور آپ محکمہ احتساب میں پکڑے گئے تھے اُس کی دارو گیر سے بچ کر چھوٹ گئے گو آپ نے یہ شعر کہا ہے اگر آپ کے کلام میں ایک شعر بھی شرعاً قابلِ گرفت مل جاتا تو یقیناً حضرت سلامت گھر واپس نہ آتے بادشاہ دشمن ہو رہا تھا مفتی فتوے دینے پر تیار تھے فوراً دار پر کھینچ دئے جاتے یا گردن اُڑا دی جاتی؛ پس یہ دعوائے آپ کا کہ "صد حکایتِ خوش بگویم و نکنم رخنہ در مسلمانی!" کچھ غلط نہیں بلکہ آزمودہ اور امتحان میں پورا اُترا ہوا ہے!

حدودِ شرع سے بھی قطع نظر کر کے حضرت کو ملزم گرداننے والا ایک اور طبقہ ہے جس کے سرگروہ مولانا حالی پانی پتی گزرے ہیں۔ آپ کو ابتدا ہی سے کچھ حافظ صاحب کی تنقیص مطلوب تھی اس مقولہ کو کہ ؎ "شعرِ حافظِ شیراز انتخاب ندارد" غلط ثابت کرنے کے لئے اوائلِ عمر ہی میں ایک انتخاب دیوانِ حافظ کا کرنا چاہا تھا بلکہ اپنے زعم میں انتخاب کر بھی لیا تھا لیکن وہ انتخاب پروان نہ چڑھ سکا کچا ہی ساقط ہو گیا یعنی جب اپنے اُستاد مرزا غالب کی خدمت میں پیش کر کے

تحسین طلب ہوئے تو مرزا نے تحسین کے بدلے اُس انتخاب ہی میں نقص نکال دیا کہ یہ شعر تو اس میں ہے ہی نہیں ؎

رنگ تزویر پیش ما نہ رود　　شیر سرخیم و افعی سیہ ایم!

خواجہ الطاف حسین حالی کا خاص اعتراض خواجہ حافظ پر یہ ہے کہ :- ان کا کلام رندی لا اُبالی کی تعلیم دیتا ہے اسراف و مبذری سکھاتا ہے : دولت کو پھونک دینے کی صلاح دیتا ہے شاید حافظ صاحب کے معاصرین میں بھی ایسے عیب جو حضرات موجود تھے دیوان کے یہ شعر انہی کی شان میں معلوم ہوتے ہیں ؎

میدارم چو جان صافی و صوفی میکند عیبش　　خدایا ہیچ عاقل را مبادا بخت بد روزی

یارب آں زاہد بہ بیں کہ بجز عیب نہ دید　　دود آہیش در آئینہ ادراک انداز

بہ لحاظ مولویت مولنا حالی کا شمار بھی علمائے ظاہر میں ہے اور یہ شعر کہ ؎ "چراغ مردہ کجا شمع آفتاب کجا" آپ پر بھی باحسن وجوہ صادق۔

مولنا حالی نے چونکہ سرمایہ پرستی کے عین شباب و عروج کے زمانے میں خروج کیا اور نشو ونما پائی آنکھ کھول کر مسلمانوں کو مفلس سرمایہ کو غائب اور دولت کے فقدان سے قوم کو دنیاوی ذلتوں میں گرفتار و مبتلا دیکھا لہذا دولت و سرمایہ آپ کی نظروں میں بڑی عزیز چیز ٹھہرے۔ روپے کو جمع رکھنا اور ٹھوک لگا لگا کر جوڑنا آپ کے نزدیک مسلمانوں کا مذہب ہونا چاہئے تھا لیکن اس زمانے میں جب کہ سرمایہ داری کی پول کھل گئی ہے اور وہ دنیا کے لئے علمی اور عملی طور پر لعنتِ عظیم ثابت ہو چکی۔

خواجہ حافظ کے ان اشعار کی تعلیم کو اب کوئی دانشمند غلط اور بدراہی کی تعلیم نہیں کہہ سکتا الّا مولنا حالی اور اُن کے متبعین ؎

چو گل گر خردہ داری خدا را صرف عشرت کن　　کہ قاروں را غلطہا داد سودائے زر اندوزی

خزینہ داری میراث خوارگاں کفر است — بقول مطرب و ساقی و بفتوئے دف و نے!

پہلے شعر میں "خدارا صرف عشرت کن" کے معنی مولانا حالی کا فریق تو یہی لے گا کہ بتاکید منت تمام کہنا مقصود ہے کہ اگر کچھ بھی سرمایہ تیرے پاس ہو تو عیش و عشرت میں اُس کو اُڑا دال" لیکن "خدارا" کے ایک اور معنی بھی ہیں جو انصافاً یہاں لگتے ہیں۔ یعنی خدا کی راہ میں" بالفاظ دیگر خلقِ خدا کی (رفع) عسرت یا آرام کے لئے صرف کردے" جیسے زرگل رفع تکلیف خلق کیلئے دوا میں کام آتا ہے۔ باقی رہا رندی اور لاابالی سکھانے کا الزام تو کوئی شعر جس میں اس کی تعلیم ہو اُس کو بھی پرکھ لیا جا سکتا ہے مثلاً رندی و لاابالی کی تعلیم میں اس سے بڑھ کر جو بی کا شعر کیا ہوگا ؎

ہنگام تنگدستی در عیش کوش و مستی — کیں کیمیائے ہستی قاروں کند گدارا

غور کرنے سے عقل و نقل دونوں طرح پر اس شعر کی تعلیم کی خوبی اور مبارکی ثابت ہوتی ہے۔ کم مسلمان ہوں گے جو اس حدیث سے واقف نہ ہوں جس میں مذکور ہے کہ پیغمبر صاحب کے پاس کوئی شخص آیا اور مفلسی کی شکایت کی آپ نے فرمایا کہ نکاح کر" اُس نے نکاح کر لیا مگر کچھ فلاح نہوئی پھر آیا اور شکایت کی آپ نے فرمایا کہ ایک نکاح اور کر" غرض اسی طرح تیسرا اور چوتھا نکاح بھی کرا دیا البتہ چوتھے نکاح کے بعد ایسی فلاح ہوئی کہ وہ مفلس مالدار ہوگیا" یہاں اس حدیث کے ضعیف و قوی ہونے سے بحث نہیں یہ حدیث مشہور ہے اور شعر زیر بحث میں اس کی تلمیح موجود شاعر نے تنگدستی میں عیش کوشی کا اصول اسی سے اخذ کیا ہے اور اسپر عمل آوری کو فلاح و بہبود کے لئے وہ مجرب آزمودہ نسخہ کیمیا بتایا ہے جس سے مفلس مالدار ہوگیا تھا۔

عقلاً اس شعر کی تعلیم کے صحیح ہونے میں کوئی کلام ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر مفلسی کے بارِ غم سے ہراساں انسان اپنے افکار لاحقہ کو بکوشش تمام نہ بھلائے اور دل نہ بہلائے تو وہ بارِ غم اُس کو لے بیٹھے آدمی کچھ کر ہی نہ سکے ایسی صورت میں بڑے سے بڑا حکیم و دانشمند بھی یہی صلاح

دے گا کہ حتی الامکان دل کو خوش رکھنا اور افسردہ نہ ہونا چاہیئے۔ بالکل یہی بات حافظ صاحب نے اِس شعر میں کہی ہے۔ بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ایسی صورت میں خوب دل کھول کر رنگ رلیاں منانے کی صلاح دی ہے۔ مگر رنگ رلیاں بغیر روپے کے نہیں منائی جا سکتیں اور شعر میں وہ شخص پہلے ہی قلاش مانا گیا ہے لہذا دل خوش رکھنے اور افسردہ نہ ہونے ہی کے معنی لئے جا سکتے ہیں دوسرے معنی متعذر ہیں۔

الغرض جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ آئے ہیں۔ اصول کی غلط تعلیم حافظ صاحب کے ہاں نہیں ہے۔ حافظ صاحب سے ایک شکایت خیال و ذہن میں چھپی ہوئی شاید یہ بھی ہو کہ اُن کے کلام میں آہ و درد نہیں یعنی وہ رونا جھینکنا اور قوم کے اقبال کا ماتم نہیں جو کہ زار دشعرا کی شاعری کا رنگ ہے لیکن ہم اِس مقالہ کی ابتدا میں یہ ذکر کر آئے ہیں کہ قوم کا اقبال عہد حافظ میں از سرِ نو عروج پر تھا مشرق سے مغرب تک مسلمانوں کا بول بالا اور اسلام کا ڈنکا بج رہا تھا۔ تیمور نے روس کو شمال میں دھونس رکھا تھا ترک وسط یورپ میں وائنا کا محاصرہ ڈالے پڑے تھے اسپین میں بھی مسلمان ہنوز براج رہے تھے خلجیوں اور تغلقوں کے ہمالہ سے راس کماری تک جھنڈے گڑے ہوئے تھے الغرض مسدسِ حالی لکھنے کا کوئی وقت دموقع نہ تھا۔ انند کے تار بجانے اور مسرت کے ترانے گانے کا زمانہ تھا لامحالہ حافظ کا دیوان اِن ترانوں سے مالامال و رنگین ہے۔ حالی و اقبال جو قوم کے ماتم میں منہ لپیٹے رو رہے ہیں ان کو یہ راگ بے وقت کی راگنیاں محسوس ہوں اور خوشی کے ترانے خوش نہ آئیں تو یہ بھی ایک قدرتی اور واجبی امر ہے ؎

کہاں کی رُباعی کہاں کی غزل جب اپنا ہی جوڑا گیا ہو نکل؛

بہرحال مطلق یہ کہدینا کہ حافظ کا کلام رندی لا اُبالی سُرفی مبذری سکھاتا ہے دیانت تنقید کے بھی خلاف ہے استثنا لازم ہے اسواسطے کہ دیوان بے تعداد کام کی باتوں مفید نصیحتوں اور نکات

سے بالکل خالی بھی نہیں بلکہ پٹا پڑا ہے دیوان کے اشعار و غزل کی چھان بین کر کے ہم نے اُن نصائح و نکات کی تعداد کو جو اس میں جا بجا مرصع ہیں پہنچنا چاہا تو اتنی کثرت پائی کہ ردیف تا کے وسط تک ہی پہنچکر قلم تھک گیا اور اس کام سے جی چھوٹ گیا۔ نتیجہ اس چھان بین کا یہاں درج کرنا اگرچہ خالی از طوالت نہیں لیکن دلچسپی سے بھی خالی نہیں ہوگا لہذا ہم نمبروار درج کرتے ہیں :۔

(۱) ابتدائے مہمات آسان نظر آتی ہے لیکن بعد میں مشکلات عظیم سے دوچار ہونا پڑتا ہے (۲) واقف کاروں ماہروں کے کہنے پر بے چون و چرا عمل کرنا چاہیئے کہ وہ کنہ کار سے واقف ہوتے ہیں اور تم ناواقف (۳) خود رائی خود کامی خرابی اور رسوائی کا موجب ہوتی ہے (۴) مجموں میں مذکور ہوکر راز چھپ نہیں سکتا (۵) زمانہ کی سازگاری دائمی نہیں عارضی ہوتی ہے (۶) بھلائی کرنے کی تا وقتیکہ قدرت ہو بھلائی کر لینی چاہیئے (۷) یاروں کے ساتھ یاری تو دشمنوں کے ساتھ بھی مدارا رکھنا چاہیئے (۸) کفر و سرکشی نہ کرو (۹) فقر و فاقے میں بھی خوش و خرم رہنے کی کوشش کرو (۱۰) زندۂ عشق انسان فانی نہیں زندۂ جاوید ہے (۱۱) باقاعدگی اور بے اصولی میں زمین آسمان کا فرق ہے (۱۲) مستفیض اور مستفید ہونے کے لئے اہلیت شرط ہے (۱۳) چراغِ مردہ کو آفتاب بھی روشن نہیں کر سکتا (۱۴) دانا بزرگوں کی نصیحت بدل و جان قبول کرنی چاہیئے (۱۵) حسن آرائش سے مستغنی ہے (۱۶) آرائش پر مرنا اوچھے پن کی علامت اور اوچھی الفت ہے (۱۷) راز دہر کی بحث و جستجو فضول ہے عقل و حکمت یہاں عاجز ہیں (۱۸) لطف و خوبی یہ و لفظ تمام کلام اللہ کی تفسیر اور نچوڑ ہیں (۱۹) غریبوں کی آہ لینی اچھی نہیں صبر پڑ جایا کرتا ہے (۲۰) مکاروں فریبوں کا حاصل وسوز بجز ہوا کچھ نہیں۔ (۲۱) عشق میں عافیت کہاں (۲۲) نقد ہاتھ آتے کو چھوڑنا نہ چاہیئے (۲۳) حقِ خدمت کو

فراموش نہ کرنا چاہیے (۲۴) ماتحتوں غلاموں پر مہربانی کی نظر رکھو انہیں خستہ حالی میں مرنے کو نہ چھوڑدو (۲۵) دنیا میں ہمیشگی و دوام کا ٹھیکہ کسی کا نہیں (۲۵) عیش و نعمتِ دنیا کسی کا دائمی حصہ یا کسی کے ٹھیکے میں نہیں (۲۶) کسی کی بدحالی و معصیت پر طنزاً ہنسنا زیبا نہیں (۲۷) اہل اللہ کی سنگت کشتی نوح ہے جس کو غرقابی کا ڈر نہیں (۲۸) فانی نعمتوں پر کیا رشک و حسرت!! (۲۹) رازِ ہستی دریافت ہونے والا نہیں (۳۰) پیوند خاک ہی ہوجانا ہے تو فلک فرسا ایوان کیوں اٹھائیں (۳۱) آزادی اور قناعت گنج بے زوال ہیں (۳۲) قرآن کو فریب دہی کا آلہ کار بنانا مے خواری اور رندی سے بھی بدتر ہے (۳۳) مرتبہ پاکر ہم چشموں سے گریز و نفرت کرنا شایاں نہیں (۳۴) اہلِ نظر حُسن خلق سے رام ہوسکتے ہیں مکر و فریب سے دام میں نہیں آسکتے (۳۵) لطف و آشتی سے بھی وہی کام نکل سکتا ہے جو غیظ و غضب سے (۳۶) حسن میں اکثر وفا کی کمی پائی جاتی ہے (۳۷) جس طرح ہوسکے نخوت نفس کو توڑنا چاہیے (۳۸) زہد ریائی کو چھوڑنا چاہیے (۳۹) محرم دل عنقا ہے دُنیا بھر میں تلاش کرنے سے بھی نہیں ملا (۴۰) غم ایام لازمۂ زندگی ہے پروا نہ کرنا اس کا علاج ہے (۴۱) دل اُکتا جانے پر بھی غم روزگار کو بخندہ پیشانی گزارنا چاہیے (۴۲) مشکلیں برداشت کرنی چاہییں (۴۳) آخر کار مشکلیں سہل ہوجایا کرتی ہیں (۴۴) آرام سے گزارنے والوں کو تکلیف سے گزارنے والوں کی خبرگیری لازم ہے (۴۵) وقت عزیز نایاب ہوجایا کرتا ہے اُس کو بیکار نہ جانے دینا چاہیے (۴۶) رنج و عیش لازم و ملزوم ہیں گل بے خار دنیا میں نہیں پایا جاتا (۴۷) جس کا دل اور زبان ایک ہو اُس کے قربان جانا چاہیئے۔ (۴۸) دنیا فانی اور بے وفا ہے (۴۹) جہاں میں خندہ رو رضا بقضا رہنا چاہیے (۵۰) خود فروشوں کی بستی سے ہم دور رہتے ہیں (۵۱) کسی محبت کی بے قدری نہ چاہیے (۵۲) آدمی کو صدق کوش ہونا چاہیے (۵۳) لباس اطلسی ہنر سے عاری ایک جَو کی قیمت نہیں رکھتا (۵۴) فلک سروری تک پہنچنا بڑی دشواریاں اٹھاکر میسر

آتا ہی (۵۵) کم آزاری میں نجات مضمر ہی (۵۶) تمہارے ہاتھوں کسی کا کام نکلتا ہو تو جلد نکالو
(۵۷) خیر میں اپنا بھلا سمجھو (۵۸) ارباب بیمروت کے محلوں پہ جھانکنے سے بہتر کہ اپنے جھونپڑے
میں پڑے رہو (۵۹) کارِ خیر میں کسی استخارے کی مطلق ضرورت نہیں (۶۰) کشتِ عاقبت میں
کوئی دانہ اگر نہ بویا تو وہاں کیا پاؤ گے (۶۱) دوزخ و بہشت کی آرزو میں نہ پڑو خدا کی رضا
جوئی کرو (۶۲) موذی کی طرف اشارہ نہ کرو کہ مبادا تم پر پلٹ پڑے (۶۳) دشمن کے تلوار
اُٹھانے کا جواب سپر ڈال دینے سے دینا چاہیئے اہمسا کرنی چاہیئے (۶۴) سب گنہ حلال
صرف کسی کے درپے آزار ہونا حرام (۶۵) دآفسکاروں کی بے دھڑک تغلیط نہ کرو۔
(۶۶) چغلخوروں کو اپنی خلوت میں بار نہ دو (۶۷) خطرے کی جگہ ہوش گوش سے رہنا چاہیے
(۶۸) اتفاق باہمی سے دنیا کو فتح کر سکتے ہیں (۶۹) شیخی بری صفت ہے (۷۰) اِس
زندگی سے غرض شرفِ صحبتِ یار (معرفتِ الٰہی) ہی (۷۱) جان کھو کر جو مال ملے اُس پر لعنت
(۷۲) پنج روزہ زندگی بسا غنیمت ہی (۷۳) عزت و نگیں جہاں گوراں سب ہیچ ہیں (۷۴)
فقیروں کی دستگیری چاہیئے (۷۵) کریموں کو تقاضوں سے ستانا نہ چاہیئے (۷۶) لوٹ
نہ مچاؤ (۷۷) دشمن سے کچھ جنگ و محاربا نہ چاہیئے (۷۸) ہنر میں خود جلوہ گری کی صفت ہے
جتانے کی ضرورت نہیں (۷۹) بدگو مر کے چھوٹ نہیں جاتا کراماً کاتبین کی پکڑ میں پڑتا ہی
(۸۰) دنیا میں آج اِس کا کل اُس کا دور دورا بدلتا رہتا ہے (۸۱) ہر ایک کے فکر و
خیال کی پہنچ اُس کی ہمت و حوصلہ کی حد تک ہے (۸۲) ہر چیز کی بنا بودی ہے مگر محبت
کی بنیاد کو زوال نہیں (۸۳) علم پر عمل نہ کرنا موجبِ ملال ہوتا ہے (۸۴) دھوئے سے
حبشی گورا نہیں ہو سکتا (۸۵) منعموں کا زور و زر مفلسوں ہی کی دولت ہے (۸۶) محتاجوں
کے صبر سے گنج قاروں دھنسا جا رہا ہے (۸۷) جو علما حقیقت کو نہ پہنچے اُن جاہلوں سے

مشاہیر ہیں جو دیکھے نہ پہنچے) وادیوں ہی میں کھوئے رہ گئے (۸۸) زہد فروشی بدتر از مے نوشی ہے (۸۹) حق پرستی کریں اور کسی کی برائی نہ چاہیں اس کے سوا کچھ گناہ نہیں (۹۰) خدا کے دیکھنے کو دل کی آنکھ ہونی چاہئے وغیرہ وغیرہ" اس طرح لکھتے چلے جائیں تو ان مقولات کا شمار ہزاروں تک پہنچ جائے۔ پوری غزلیں بھی سرتاپا نصیحت میں ملتی ہیں دیکھو غزل ؎ ما گوئیم بد و میل بناحق نکنیم الخ

اب حالی مو الی بتائیں کہ ان کے کلیات میں ت سے نصف تک ان بیش بہا اصول و نصائح و نکات کی کیا تعداد ہے؟ حافظ کا قصور سمجھو یا "آرٹ" کہ انھوں نے ساغر و مینا میں بھر کر کشتی مے میں لگا کر رنگین الفاظ اور دلآویز نغموں میں حل کر کے عشق و محبت کی زبان یعنی پیرایۂ غزل میں دلچسپ بنا کر ان مقولات کو پیش کیا ہے مثلاً نصیحت (۷) ان الفاظ میں ہے ؎

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید	کہ سالک بیخبر نبود ز راہ و رسم منزلہا!

نصیحت ۲۵ اس طرح ادا ہوئی ہے ؎

در بزم دور یک دو قدح درکش و برو	یعنی طمع مدار وصال دوام را

نصیحت ۳۲ کا انداز یہ ہے ؎

حافظا مے خور و رندی کن و خوش باش ولے	دام تزویر مکن چوں دگراں قرآں را

ہم نے صرف ظاہری معنی لینے پر اکتفا کیا ہے اگر صوفیہ کی تاویلات سے کام لیا جائے تو بلا استثنا تمام اشعار لطایف معرفت بنجاتے ہیں جنھیں قدسی زیر عرش بیٹھے تلاوت کیا کریں ؎

صبحدم از عرش می آمد خروشے باز گفت	قدسیاں گوئی کہ شعر حافظ از بر می کنند

معہذا عام انسانوں کے لئے رقص و سرود اور جشنِ سروروں میں گانے بجانے کا سامان مہیا کریں جس سے کسی قوم کا خزینۂ شعر و ادب خالی نہیں نہ کوئی شرع ان کو ممنوع کر سکی ہے ان کو ممنوع اور مذموم قرار دینا ایک ایسا غیر فطری امر ہے جس کی تعمیل کسی عہد میں ہوئی اور نہ آیندہ ہو سکے گی ایسی غزل

اور ان اشعار کو گانے بجانے نیز رقص کرنے سے کون باز رہ سکتا اور رکھ سکتا ہے ؎

مطربِ خوش نوا بگو تازہ بتازہ نو بنو ۔۔۔ بادۂ دلکشا بجو تازہ بتازہ نو بنو

با صنمے چو لعبتے خوش بنشیں بخلوتے ۔۔۔ بوسہ ستاں بکام از و تازہ بتازہ نو بنو

بر ز حیات کے خوری گر نہ مدام مے خوری ۔۔۔ بادہ بخور بیادِ او تازہ بتازہ نو بنو الخ

بجز سودا او داغ و نظیر اکبر آبادی کے میر سے لے کر غالب و حالی تک ہمارے شعرا کا تمام جرگہ بسوریوں کی ایک جماعت ہے جو اپنی قبل از مرگ و وفات کے خود گفتہ مرثیے سنا سنا کر طبیعتوں کو خواہ نخواہ غمگین اور بچپن ہی سے اندوہگیں و حزیں بناتے رہتے ہیں یہاں تک کہ تمام قوم پر مُردنی چھا گئی ہے اور دل افسردہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ خوش باشی زندہ دلی اور نشاط کے ترانے ہمارے شعرا کے کلام میں بمنزلہ نایاب ہیں کلامِ حافظ ایک سمویا ہوا کلام ہے جس میں آہ اور واہ دونوں چیزیں بحدِ اعتدال موجود ہیں۔ رندانہ ترانوں میں اکثر آپ کا انداز یہ ہے کہ روحِ نشاط کو اُمنگ میں لا کر اور ترنگ پر چڑھا کر جب دیکھتے ہیں کہ یہ اُمنگ اور ترنگ حد سے بڑھنے لگی تو فوراً لہجہ بدل کر عبرت دلانے یا نصیحت کرنے لگتے ہیں جیسے اِس غزل میں ؎

عید ست و موسمِ گُل و یاران در انتظار ۔۔۔ ساقی بروئے شاہ ببیں ماہ و مے بیار

دل برگرفتہ بودم از ایامِ گُل و لے ۔۔۔ کارے بکرد ہمتِ پاکانِ روزہ دار

گر فوت شد سحور چہ نقصاں صبوح ہست ۔۔۔ از مے کنند روزہ کشا طالبانِ یار

جز نقدِ جاں بدست ندارم شراب کو ۔۔۔ کاں نیز بر کرشمۂ ساقی کنم نثار

ترسم کہ روزِ حشر عناں بر عناں رود ۔۔۔ تسبیحِ شیخ و خرقۂ رندِ شراب خوار

خوش دولتے ست خرّم و خوش خسروِ کریم ۔۔۔ یارب ز چشم زخم زمانش نگاہدار

مے خور بشعرِ بندہ کہ زیبے دگر دہد ۔۔۔ جامِ مرصّع تو بدیں دُرِّ شاہوار

اس کے بعد نصیحت و عبرت آجاتی ہے ؎

دل در جہاں مبند ز مستی سوال کن ۔۔۔ از فیضِ جام و قصۂ جمشیدِ کامگار

خدا سے انکسار و چشم پوشی کی دعا کرنے لگتے ہیں ؎

زانجا کہ پردہ پوشیِ لطفِ عمیم تست ۔۔۔ بر نقدِ ما بپوش کہ قلبے ست کم عیار

آخر اس زندمشی کو مذاق میں اُڑا دیتے ہیں ؎

حافظ چو رفت روزۂ و گُل نیز میرود ۔۔۔ ناچار بادہ نوش کہ از دست رفت کار

ذیل کی انتہائی رندانہ اور قلندرانہ غزل میں بھی یہی انداز ہے ؎

مرا مے دگر بارہ از دست برد ۔۔۔ بمن باز آورد مے دستبرد

ہزار آفریں بر مئے سرخ باد ۔۔۔ کہ از روئے ما رنگ زردی ببرد

بنازم بدستے کہ انگور چید ۔۔۔ مریزاد پائے کہ درہم فشرد

بروز ازل خوردہ بر من مگیر ۔۔۔ کہ کار خدائی نہ کاریست خرد

مرا از ازل عشق شد سرنوشت ۔۔۔ قضائے نبشتہ نشاید سترد

اب یہاں سے رندی ختم اور نصیحت آغاز ہو جاتی ہے ؎

مزن دم ز حکمت کہ در وقتِ مرگ ۔۔۔ ارسطو دہد جاں چو بیچارہ کرد

مکن رنج بیہودہ خرسند باش ۔۔۔ قناعت کُن این اطلس چو بُرد

چناں زندگانی کُن اندر جہاں ۔۔۔ کہ چوں مردہ باشی نگویند مُرد

آخر میں اپنی ہستی کو بھی جتا دیتے ہیں کہ کس بادۂ ناب کی ہے :-

شود مستِ وحدت بجام الست

ہر آنکو چو حافظ مے صاف خورد

اب رہا یہ سوال کہ حافظ صاحب حُسن پرست ناظرِ حُسن تھے یا بد نظر نظر باز؟ اِس سوال کو
اب تک جو کچھ لکھا گیا اُس کی روشنی میں ناظرین خود بھی طے کر سکیں گے۔ ایسے پاک طینت نیک نہاد
معلّم اخلاق حقیقی درویش اہل اللہ ولی کامل کی نسبت بد نظری یا عشق فساق کا گمان جائز نہیں ہو سکتا
جہاں تک کہ الزامات نامنصفانہ اور سفیہانہ ہوں اُن کو رد کرنے کی کوشش نہ صرف مستحسن
بلکہ لازم ہے لیکن اِس کوشش میں بھی حد سے بڑھ جانا اور حافظ صاحب کو خارج از انسانیت
پہنچا دینا انسانیت کے عام جذبات و احساسات سے حضرت کو عاری اور بے بہرہ راہبوں
کی طرح حسن و عشق کی کشش و کیفیات سے غیر متاثر و دست بردار و نا آشنا قرار دینا ہے
ایسی کوشش لایعنی اور فضول ہے اگر اس میں کلام نہیں کہ آپ ایک حقیقی شاعر تھے تو یہ بھی مسلم
ہونا چاہیئے کہ حقیقی شاعر کے لئے حسن آشنا حسن کا مدح سرا حُسن پسند بلکہ حسن پر عاشق
و حسن کا شیدا ہونا قدرتی امر ہے ورنہ شاعر نہیں ؎

حافظ ہر آنکہ عشق نورزید و وصل خواست　　　احرام طوف کعبۂ دل بے وضو بہ بست

اگرچہ یہ شعر تصوف میں اور عشق سے مراد معرفت ہے لیکن اس میں مہر ورزی اور محبت کی
تعلیم و تلقین بھی موجود ہے یعنی عشق کرنا سیکھو۔ بغیر عشق کے آدمی آدمی نہیں بنتا۔
حضرت خواجہ حافظ نے جو عشق کئے اُن کی صداقت و پاکیزگی میں کوئی شک نہ ہونا چاہیئے
آپ کی تمام سیرت و اخلاق و کمالات نے عشق ہی کے ذریعہ جلا پائی ؎

غبار خاطرِ حافظ ببرد صیقلِ عشق　　　صفائے نیّت پاکان و پاک بیناں بیں

عشق پاک اور حسن پرستی کی بدولت حافظ صاحب حافظ بنے۔ یہ ہمارا ہی خیال نہیں
بلکہ حضرت کو بھی اس کا اعتراف ہے ؎

"ما مرا عشق تو تعلیم سخن گفتن کرد　　　خلق را وِردِ زباں مدحت و تحسین منست

بہت سے اشعار و غزل آپ کے عشقِ مجازی کی رُوداد، حُسنِ صورت کی مدح سرائی، عشق و محبت کے معاملات و واردات سے مملو ہیں علم و فضل کی تکمیل کے لئے آپ رودآور[۱] (ایران کا کوئی دیہات یا قصبہ ہے) ترکِ وطن کرکے فارس کے پایہ تخت شیراز کو آتے ہیں شیراز اُسوقت علم و فضل کا سرچشمہ اور حُسن و کمال کا مجمع ہونے کیوجہ سے عروس البلاد کے لقب کا مستحق تھا اُسوقت کے آپ کے جذبات اِن اشعار میں قلمبند ہیں چھوٹتے ہی مطلع میں اپنی حسن پسندی کا اقرار ہے ؎

من دوستدارِ روئے خوش و موئے دلکشم — مدہوشِ چشمِ مست و مے صاف بیغشم

دوسرے شعر میں فرماتے ہیں کہ شیراز حسینوں اور حسن کی کھان ہے اور میں جوہرِ حسن کا مفلس جوہری قدر دان افلاس کے مارے پریشان ؎

شیراز معدنِ لبِ لعل ست و کانِ حُسن — من جوہری مفلس ازاں رُو مشوشم

ہزارہا پری جمالوں کی مخمور آنکھیں دوچار ہو ہو کر ہوش اُڑائے دیتی ہیں مست بنا رکھا ہے ؎

از بسکہ چشمِ مست دریں شہر دیدہ ام — حقا کہ مے نمی خورم اکنوں و سرخوشم

جدہر دیکھو حسینوں کے عشوہ و ناز اور جھُرمٹ کے جھُرمٹ خریداری کے لئے مگر کوڑی پاس نہیں ؎

شہریست پُر کرشمہ و خوباں ز شش جہت — چیزیم نیست ورنہ خریدار ہر ششم

ایک بھولا دیہاتی (آدم بہشتی) اِس سفر میں (شیراز آکر) جوانانِ مہوش کے عشق میں اسیر ہوگیا ہے ؎

من آدمِ بہشتیم اما دریں سفر — حالا اسیرِ حُسنِ جوانانِ مہوشم

حسینوں سے دوستی اور حسن پر شیفتگی کے اظہار کے ساتھ مفلسی کا نوحہ بعض غزلوں میں بھی پایا جاتا ہے جو اِسی زمانے اور عہدِ شباب کی متصور ہونی چاہئیں ازانجملہ یہ غزل ہے جس میں دل

[۱] رودآور سے محمد حافظ نام الخ (رباعی) دیکھو صفحہ ۱۱۸

کہیں آیا ہُوا معلوم ہوتا ہے مگر زرنیست عشق ٹین ٹین کا مضمون ہو ہے

بچشم مہر اگر بامن ہمہ را یک نظر بودے ۔ ازاں سیمیں بدن کامم بخوبی ہمچوں زر بودے
زشوق افشاندمے ہر دم سرے در پائے جانانم ۔ دریغا گر متاع من نہ ازیں مختصر بودے
ہمش مہر آمدے بر من زمہر آں شاہ خوباں را ۔ گراز درد دل زارم بیکے روزش خبر بودے
بوصلش گر مرا روزے زمہراں فرصتے بودے ۔ مبارک ساعتے بودے چہ خوش روزے اگر بودے

یہ شعر بھی اسی شکایت میں ہو ہے

زدست کوتہ خود زیر بارم ۔ کہ از بالا بلنداں شرمسارم

ایک اور غزل میں بھی یہی حال ہو عشق میں گرفتار لیکن مفلسی نے ناچار ہیں اور ناکام ۔ دوسرے زر و زیور لالاکر اُس حسین معشوق کو دیتے اور پہناتے ہیں آپ مفلسی سے خالی عشق جتانے کی ندامت میں مرے جاتے یہ اشعار گاتے ہیں ہے

ز زرت کنند زیور بہ زرت کشند دربر ۔ من بینوائے مضطر چہ کنم کہ زر ندارم
دگرم مگو کہ خواہم کہ ز در گہت براںم ۔ تو بریں و من بہ آنم کہ دل از تو بر ندارم

شعر ذیل سے بھی یہی کیفیت آشکارا ہے ہے

من گدا ہوس سرو قامتے دارم ۔ کہ دست در کمرش جز بسیم و زر نہ رود

لہذا دل کو سمجھاتے ہیں کہ اس کی ہوس فضول ہو لیکن مٹھاس پر جانے سے مکھی کیسے باز رہ سکتی ہے ؟ ہے

طمع دراں لب شیریں نہ کردنم اولٰے ۔ ولے چگونہ مگس از پئے شکر نرود

یہ ضرور بالضرور کسی نولی زرپرست کا عشق ہو جو حافظ صاحب کو مفلسی میں پریشان کئے ہوئے ہے !

روایتاً مشہور ہے کہ شاخ نبات نام کسی مطربہ پر آپ عاشق تھے بعض شعروں میں یہ نام وارد بھی ہوگیا ہے جیسے اس غزل کے مقطع میں ؎

حافظ چہ طرفہ شاخ نباتست کلک تو — کش میوہ دلپذیر تر از شہد و شکرست

اسی غزل کے مطلع میں آپ نے رنڈی منڈی (سرو صنوبر وغیرہ) سے عشق فساق کی ضرورت کا انکار بھی کیا ہے فرماتے ہیں ؎

باغ مرا چہ حاجت سرو و صنوبر است — شمشاد سایہ پرور من از کہ کمتر ست

مصرعۂ ثانی میں "شمشاد سایہ پرور من" سے مراد آپ کی حلیلہ جلیلہ پردہ نشین بیوی الخانہ یعنی آپ فرماتے ہیں کہ مجھے رنڈی منڈی سے تعلق کی کیا ضرورت کیا میری پردہ والی بیوی کچھ کم ہے؟ آپ کی اہلیہ کا خوش صورت، خوش سیرت و نہایت اعلیٰ درجہ کی وجیہہ خاتون ہونا اُس مرثیے سے جو آپ نے اُن کی دائمی مفارقت پر لکھا ہے مترشح ہے ؎

آں یار کزو خانۂ ما رشک پری بود — سر تا بقدم چوں پری از عیب بری بود
دل گفت فرو کش کنم ایں شہر ببویش — بیچارہ ندانست کہ یارش سفری بود
منظور خردمند من آں ماہ کہ او را — در حسن و ادب شیوہ صاحب نظری بود
عذرے بنہ اے دل کہ تو درویشی و او را — در مملکت حسن سر تاجوری بود
از چنگ منش اختر بدمہر بدر کرد — آرے چہ کنم آفت دور قمری بود
خوش بود لب آب و گل و سبزہ و نسرین — افسوس کہ آں گنج گہر رہ گذری بود
اوقات خوش آں بود کہ با دوست بسر شد — باقی ہمہ بے حاصلی و بے خبری بود

گھر کی بیوی کے تمام اوصاف حسن صورت اور حسن سیرت وغیرہ مانع نہیں کہ آدمی کسی اور میں ان صفات اور اُن سے بہتر اوصاف کا معترف و مداح نہ ہو اور اگر وہ اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے ہوں

تو اُس کو مفتوں نہ کرلیں۔ شاخِ نبات کا قصہ اگر واقعی صحیح ہے تو وہ ضرور کوئی اسی قسم کی علّامہ اور حسینہ مطربہ مغنیّہ ہوگی جیسی کہ عہد محمد شاہ بادشاہ میں دہلی کی مشہور و معروف مغنیّہ نور بائی تھی جس میں اعلیٰ درجہ کے حسنِ ذات کے ساتھ اعلیٰ درجے کے صفات ذہانت و قابلیت و طبّاعی، لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی، حاضر جوابی، شعر و شاعری وغیرہ جمع ہو گئے تھے۔ نواب سالار جنگ کے جدّ امجد نواب درگاہ قلی خاں جو اُس کے دیکھنے والوں میں تھے اپنے تذکرہ "یادگار دہلی" میں لکھتے ہیں کہ "چندیں عالمے را باید کہ پیشش زانوے ادب طے کنند" نادر شاہ جیسے سفاک خونخوار کو بھی اُس نے موہ لیا تھا اور وہ تختِ طاؤس کے ساتھ اُس کو بھی ہندوستان کا ایک تحفہ بنا کر ایران لے کر چلا تھا وہی تھی کہ اُس کے چنگل سے نکل کر رستے ہی سے صحیح سلامت واپس چلی آئی۔ قابلیت کا قدرداں قابل ہی ہوتا ہے۔ حافظ صاحب ہیں جو خود دنیا بھر کے قابل ترین تھے ان اوصاف پر جان دینے مرٹنے کی سب سے زیادہ قابلیت متصوّر ہونی چاہئے ایسی نادرِ حسن و قابلیت کی مطربہ مغنیّہ کا شاہی طائفہ میں منسلک اور درباری ملازمہ ہونا بھی ایک نہایت قرینِ قیاس امر ہے اور اُس سے کسی کا تعلق کرنا ایک سنگین جرم۔ حافظ صاحب کو اُس کے عشق سے معمولی رنگ میں متہم کر کے شاید آپ کو اُس سے اور اُس کو آپ سے چھٹا دیا جاتا ہے آپ کو اِس مفارقت پر صبر کرنا پڑتا ہے۔ اِس کا اقبال اُس غزل کے ایک دو شعر سے پیدا ہے جس میں آپ ظاہرا عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی پر ترقی پانے کی خوشی میں پھولے نہیں سماتے وجد میں نظر آتے ہیں ؎

دوش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند | وندران ظلمتِ شب آبِ حیاتم دادند
بیخود از شعشعۂ پرتوِ ذاتم کردند | بادہ از جامِ تجلّی بصفاتم دادند
چوں من از عشقِ رخش بیخود و حیراں گشتم | خبر از واقعۂ لات و مناتم دادند

حُسن فانی کی وفات ہو جاتی ہے ؎

بحیاتِ ابد آں روز رسانند مرا   خطِ آزادگی از حُسن مماتم دادند

یہ سب انعام و اکرام نتیجہ ہیں "تیرے" گوناگوں غم میں صبر و ثبات کا ؎

ہاتف آں روز بمن مژدۂ ایں دولت داد   کہ بباز از غمت صبر و ثباتم دادند

غمت کی ت کی ضمیر آئندہ شعر کے مصرعۂ ثانی میں شاخِ نبات کے نام سے بدل جاتی ہے اور نہ صرف وہ دولتِ سرمد جو مصرعۂ اول شعرِ ماسبق میں مذکور ہے بلکہ آپ کے شعر و سخن کی یہ سب حلاوت و شیرینی بھی اُسی صبر کا اجر بن جاتے ہیں جو شاخِ نبات کیلئے کیا گیا تھا ؎

ایں ہمہ قند و شکر کز سخنم میریزد   اجرِ صبریست کزاں شاخِ نباتم دادند

ممکن ہو کہ یہ دھوم دھام کی قلندرانہ و مستانہ غزل شاہ شجاع سے صلح و صلاح اور آپ کے پھر اُس کی ہمصحبتی اور ندیمی کے مرتبہ پر فائز المرام ہو کر موردِ انعام و اکرام ہو جانے کی خوشی کا ترانہ ہو کیونکہ

ہمتِ حافظ و انفاسِ سحر خیزاں بود   کہ ز بندِ "غمِ ایام" نجاتم دادند

"غمِ ایام" (دورِ مصیبت و عسرت) سے نجات پانے پر دلالت کرتا ہی نیز یہ بھی ممکن ہے کہ شجاع و میل ملاپ ہو جانے پر شاخ نبات سے بھی آپ کے مراسم کھل گئے ہوں یا وہ آپ کو مل گئی ہو یعنی "بتِ شیریں حرکات" سے شعرِ ذیل میں خود شاخِ نبات ہی یا اُس سے بھی حسین تر بی بی ہو شادی ہو گئی ہے ؎

شکر شکر بہ شکرانہ بیفشاں اے دل   کہ نگارے خوش و شیریں حرکاتم دادند

بہر حال کچھ بھی معنی لئے جائیں۔ شاخ نبات کے عشق میں صبر و ثبات کرنے کی تلمیح سے یہ شعر و غزل خالی نہیں۔ اِس روایت و درایت دونوں کی رُو سے شاخ نبات کے ساتھ آپ کا تعلق خاطر ثابت و عیاں ہوتا ہی اُدھر صدیوں سے یہ دستور چلا آرہا ہے کہ لوگ شاخ نبات کا نام لے کر اُس کا واسطہ دے کر آپ کے دیوان سے فال کھولتے ہیں۔

بو اسحاق رنگیلے اور شاہ شجاع کی ندیمانہ و رحمانہ صحبتوں میں حافظ صاحب کو حسن و ادا و قابلیت و اوصاف کے مالک و تربیت یافتہ حسینوں اور ارباب نشاط سے دوچار ہونے کے بہت مواقع تھے آپ کو ان سے گریز کرنے کی کوئی وجہ بھی نہ تھی پاک باش برادر مدار از کس باک نیست تاہم آپ نے ان کی نسبت ایک شعر میں صاف کہہ دیا ہے کہ ان لوگوں سے آپ کا علاقہ صرف لطف طبع اور خوبی اخلاق پر مبنی تھا چنانچہ ان صحبتوں کی یاد ایام کے قطعہ میں فرماتے ہیں ؎

حسن مہرویان مجلس گرچہ دل میبرد و دین   عشق ما بر لطف طبع و خوبی اخلاق بود

آج سے سو سوا سو برس پیشتر تک تو مسلمانوں میں حسن ظن کی کمی نہ تھی ایسے لوگ موجود تھے جو مثلاً خواجہ میر درد اور حضرت مظہر جانجاناں کی عاشق مزاجی اور حسن پرستی کو دیکھ کر انپر اور زیادہ ایمان لاتے ہاتھوں پر بیعت کرتے ان کو پیشوا و مقتدا بناتے تھے، موجودہ نسل کی (جس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے) سمجھ میں یہ بات بیٹھنی بہت دشوار ہے کہ حسینوں سے گھرے اور حسن کے خود گرویدہ رہنے کی حالت میں غیر آلودہ اور پاک رہنا کیسے ممکن ہے۔ حافظ صاحب کے پاس اس کا جواب یہ ہے فرماتے ہیں ؎

آشنایان رہ عشق درین بحر عمیق   غرقہ گشتند و نہ گشتند بآب آلودہ

ذوق نے گویا اسی کا ترجمہ اس شعر میں کیا ہے ؎

پاک دنیا سے ہیں دنیا میں جو ہیں پاک سرشت   غرق ہے آب میں پر تر نہیں اصلا گوہر

آپ کے ہمعصروں میں بھی ایسے بدبین حاسد موجود تھے جو آپ پر سوء ظن کے مرتکب ہوتے تھے خصوصاً شاہ شجاع سے مخالفت کے زمانے میں ان لوگوں نے اس کا بہت زیادہ چرچا پھیلا دیا تھا اس کے اقرار اور انکار میں یہ شعر آپ کا اوپر نقل ہو چکا ہے ؎

منم کہ شہرہ شہرم بہ عشق ورزیدن   منم کہ دیدہ نیالودہ ام بہ بد دیدن

بہ یک وقت و بیک الفاظ اقرار و انکار کے صاف معنی یہی ہیں کہ حسن دوست ضرور ہو لیکن بد نظر نہیں "حسن کو دور ہی سے دیکھ کر آدمی آنکھیں ٹھنڈی کر لے پاس تک نہ جائے"۔ یہ اصول آپ کا تھا جو اس شعر میں ادا ہوا ہے ؎

کمال دلبری و حسن در نظر بازی ست　　　بشیوۂ نظر از ناظران دوران باش

امرد پرستی کے خلاف بھی ایک شعر میں آپ کا وعظ یہ ہے ؎

خواہی کہ بر نخیزدت از دیدہ رودِ خون　　　دل در وفائے صحبت رود[1] کساں مبند

الغرض ایک انسان صاحب دل اور حقیقی شاعر ہونے نیز غزل گوئی کی ضرورت سے آپ حسن کے عاشق تھے۔ جوان سبزہ آغاز، سادہ رو، مرد، عورت سب کے حسن پر آپ کی پسندیدگی کی مہر ثبت ہے یہاں تک کہ ڈاڑھی مونچھ والے حسن پر بھی (جس کو سن کر لوگ چونکیں گے) یہ مطلع موجود ہے ؎

اے کہ بر مہ از خط مشکیں نقاب انداختی　　　لطف کردی سایۂ بر آفتاب انداختی

لیکن چونکنے چکنے کی کوئی بات نہیں فی الحقیقت یہ لاجواب مطلع شاہ یحییٰ بن مظفر کی مدحیہ غزل کا مطلع ہے اور اسی کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے۔

تاہم آپ حسن صورت کے معمولی عاشق نہ تھے ان میں کسی وصف بالائے حسن کے خواستگار تھے آپ کو موہنے کے لئے حسن میں کوئی بات (انوکھا پن یا نمکین وغیرہ) لازمی تھی ایک غزل کے مطلع میں آپ نے اس کا ایسا صحیح معیار قائم کر دیا ہے کہ ضرب المثل ہو گیا ہے فرماتے ہیں ؎

دلبر آں نیست کہ موئے و میانے دارد　　　بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

اصلی اوصاف کے آپ دلدادہ تھے بن سنور کر تصنع سے کوئی آپ کو نہیں لبھا سکتا تھا ؎

نہ ہر کہ چہرہ بر افروخت دلبری داند الخ

[1] پسر

حسن کیا چیز ہے۔ اِس پر ایک غزل کے دو شعر مسلسل وارد ہوگئے ہیں جن سے آپ کے معیارِ حسن کی تہہ ہی گم معلوم ہوتی ہے۔ آپ اُس کا کچھ نام نہیں بتا سکتے۔ ایک لطیفۂ غیبی اور عشق کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں ؎

لطیفہ ایست نہانی کہ عشق ازو خیزد — کہ نامِ آں نہ لبِ لعل و خطِ زنگاری ست

جمالِ شخص نہ چشم ست و زلف عارض و خال — ہزار نکتہ دریں کار و بار دلداری ست

روندگانِ طریقت بہ نیم جو نخرند — قبائے اطلس آنکس کہ از ہنر عاری ست

اس بلند معیار سے کبھی نیچے بھی اُتر آتے ہیں اور ایک سچ مچ کے معشوق یا معشوقہ فرخ کے خد و خال کی تعریف میں پوری غزل لکھ ڈالتے ہیں ؎

دلِ من در ہوائے روئے فرخ — بود آشفتہ ہمچوں موئے فرخ

شود چوں بید لرزاں سرو آزاد — اگر بیند قدِ دلجوئے فرخ

بدہ ساقی شرابِ ارغوانی — بیادِ نرگسِ جادوئے فرخ

نسیم مشکِ تاتاری خجل کرد — شمیمِ موئے عنبر بوئے فرخ

اگر میلِ دلِ ہر کس بجائے ست — بود میلِ دلِ من سوئے فرخ

دو تا شد قامتم ہمچوں کمانے — زغم پیوستہ چوں ابروئے فرخ

بڑھاپے کی غزل ہے جب کہ آپ پیرِ خمیدہ قامت ہو گئے ہیں اور تو کیا گمان کیا جا سکتا ہے گمان صحیح یہ ہے کہ خائے معجمہ کی ردیف کی کوئی غزل دیوان میں نہ تھی فرخ کے نام نے اس غزل میں آکر یہ کمی پوری کر دی۔ فرخ بھی خوش ہوگئی یا خوش ہوگیا ہوگا۔ آپ کی بدولت اسکا نام بھی دنیا میں رہ گیا۔

ہر حرف کی ردیف میں غزل کہہ کر دیوان کو مکمل کرنے کا خیال آپ کا اِس شعر سے ظاہر

ہے کہ یہ غزل قصداً ردیف ض کو دیوان میں لانے کے لئے لکھی گئی ہے ؎

غزل بقافیۂ ضاد نیاید اے حافظ — مگر ہم از تو بیاید طبیعتِ فیاض

آپ کی شخصیت نہایت دلچسپ اور آپ بلا مبالغہ ایک بے مثل اوصاف کے انسان تھے تمام کلام منظوم اس کا شاہد ہے کہ آپ کی بات بات میں ایک بات نکلتی اور لطیفہ سرزد ہوتا تھا۔ آپ کی معمولی بات کو بھی لطیفہ و نغز سے خالی نہیں تصور کیا جا سکتا یہ وہ وصف ہے کہ بڈھے بالے سبھی اس کے دلدادہ ہوتے ہیں اور ایسے شخص کے گرویدہ رہتے ہیں مکھیوں کی طرح گرتے اور پروانوں کی طرح ٹوٹتے ہیں۔ ازانجملہ ایک امرد جوان مفتی زادے کا قصہ تذکروں میں ہے کہ وہ آپ کی خدمت میں حاضر تھا سرو کے سایے کے تلے کسی کنج چمن میں نشست تھی آپ کے بدنام کنندوں میں سے کسی نے اس کے باپ سے بدگوئی کی اور اس نے عین الیقین حاصل کرنے کے لئے اوٹ میں کھڑے رہ کر اس خلوت میں جھانک کر دیکھا اور کن سن پال لیں تو نہایت پاکیزہ گفتگو سنی اور بہت پاک صحبت نظر آئی۔" حافظ صاحب کی پرایوٹ لایف کے تقدس و پاکیزگی کو ثابت کرنے کے لئے یہ قصہ تراشا ہوا نہیں۔ دیوان میں ایک غزل اس کی حقیقت پر دال ہے فرق صرف یہ ہے کہ غزل سے مفتی زادے کے بجائے اس صحبت میں وزیرزادہ پایا جاتا ہے اور مفتی نہیں، وزیر اوٹ میں کھڑا رہ کر دیکھتا ہے۔ آپ کی بزرگ منشی درویشی کا قائل و معترف ہو کر چلا جاتا ہے اور غالباً بدگوئی کرنے والوں پر وزیر کی ڈانٹ پڑتی ہے اس طرح یہ قصہ فاش ہو کر حضرت حافظ صاحب کی بھی سماعت میں آتا ہے آپ اس پر یہ غزل لکھتے اور وزیرزادے سے عشق کی تہمت کو حسب عادت اپنے اوپر اوڑھ لیتے ہیں مگر کیسے مزے مزے کی تاویلیں کرتے ہیں ؎

گر من از باغ تو یک میوہ بچینم چہ شود — پیش پایت بچراغِ تو بہ بینم چہ شود

یارب اندر کنفِ سایۂ آں سرو بلند — گر من سوختہ یکدم بنشینم چہ شود

آخر اے خاتمِ جمشید سلیماں آثار، گرفتد عکسِ تو بر لعل نگینم چہ شود

زاہدِ شہر چو مہرِ ملک و شحنہ گزید من اگر مہرِ نگارے بگزینم چہ شود

خواجہ دانست کہ من عاشقم و ہیچ نگفت

حافظ ار نیز بداند کہ چنینم چہ شود!

ان اشعار کے خط کشیدہ الفاظ سے مراد وزیر زادہ ہے اور "خاتمِ جمشید سلیماں آثار" سے مراد خود آصفِ عہد یعنی وزیر بادشاہ سلیماں جاہ، اور "لعل نگینم" سے مراد حافظ صاحب کا گوہرِ قلب۔ مقطع میں کس قدر انکسار درویشی سے فرماتے ہیں کہ خواجہ (وزیر) تو مجھے عاشق (درویش) سمجھ کر خاموش رہا کچھ نہ کہا۔ کاش میں فی الحقیقت بھی درویش ہوتا اور یہ خیال اپنی نسبت خود بھی کر سکتا!

اگلے زمانے میں دستور تھا اور شاید اب بھی ہوگا کہ شہر محصور و مفتوح کے اشراف و عمائد فاتح کے لشکر میں وفد بنکر جاتے اور شہر کی کنجیاں اظہارِ اطاعت کے ساتھ پیش کر کے امن کی درخواست کرتے تھے ایسے کسی وفد میں حافظ صاحب بھی شریک ہو کر جاتے اور ایک غزل سناتے ہیں جو ہم نے کسی نسخۂ دیوان سے نقل کی تھی ہمارے پاس سے جاتی رہی ہو لیکن اس کا ترجمہ جو ہم نے کر لیا تھا یہ ہے ؎

لینے درگاہِ جلالت میں پناہ آئے ہیں شرم سے آپ پئے عذرِ گناہ آئے ہیں

لڑکھڑاتے ہوئے طے کر کے بہت دشتِ مغاک نکلی پڑتی ہو زباں بر سرِ چاہ آئے ہیں

نہیں امید پہنچنے کی سلامت بہ کنار ایسے گرداب میں سب غرقِ گناہ آئے ہیں

شوقِ دیدار میں طے کر کے رہِ دور و دراز سر پہ ساماں ہو گم گشتہ کرو اہ آئے ہیں

غیر تقصیر کوئی عذر نہیں لائے ہیں عفو کر، لب پہ لئے نالہ و آہ آئے ہیں

حافظا غیر گنہ ہم سے بھلا کیا ممکن، روزِ اوّل ہی سے ہم نامہ سیاہ آئے ہیں

خط کشیدہ الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہت دور فاصلہ پر جا کر یہ معافی مانگنی پڑی ہے غالباً اصفہان کو جب امیر تیمور نے تہ تیغ کیا ہے اور شیراز کی باری آنے کو تھی اُسوقت یہ لوگ دوڑ کر امیر کے پاس شیراز سے اصفہان پہنچے اور امان طلب ہوئے ہیں۔ اسی موقع پر یا آئندہ جب امیر نے دوبارہ آ کر شیراز کا بھی صفایا بولا ہے شہر میں آدمی کا نام نہیں رہا ہے حافظ صاحب کا آدمی کی صورت کو ترسنا تنہائی میں گھٹنا شیراز میں ہُو کا عالم غزل ذیل کے اوّل دو شعر سے مترشح ہے ؎

سینہ مالا مالِ درد ست اے دریغا مرہمے ۔۔۔ دل ز تنہائی بجاں آمد خدا را ہمدمے!

آدمِ خاکی دریں عالم نمی آید بدست ۔۔۔ عالمِ دیگر بباید ساخت از نو آدمے

مظفری شاہزادے کے لئے شمع چگل کا لفظ پہلے بھی حافظ صاحب نے ایک شعر میں استعمال فرمایا ہے دیکھو صفحہ ۱۰۲ شعر ذیل میں پھر یہ لفظ وارد ہوتا ہے اور اس سے مراد شیراز کا کمسن بادشاہ زین العابدین ہو سکتا ہے جو امیر کی آمد آمد پر فرار ہو کر اپنے چچا شاہ منصور کے پاس پناہ گزین ہو گیا تھا حافظ صاحب اُس کے درد میں یہ شعر لکھتے ہیں ؎

سوختم در چاہ صبر از بہرِ آں شمع چگل ، ۔۔۔ شاہ ترکاں غافل است از حالِ ما کو رستمے؟

دوسرے مصرعہ میں شاہ ترکاں سے مراد امیر تیمور ہے جو ترکستان کا بادشاہ گویا شاہنامہ کا افراسیاب تھا جس کی قید سے رستم نے جا کر بیژن کو رہائی دلائی تھی حافظ صاحب بھی اپنے شاہ و شہزادے کی رہائی کے لئے کسی رستم کی آرزو کر رہے ہیں۔ اگر مراد زین العابدین کی رہائی ہو تو اُسے اِس غزل کی تحریر کے وقت امیر کی قید میں سمجھنا لازم آتا ہے۔

آئندہ شعر میں شاہ زین العابدین کو نازپروردہ، بے فکرا، خامکار جتا کر۔ کوچہ رندی میں رہروی (سلطنت کرنے) کے ناقابل ہونے کی طرف اشارہ کر کے امیر تیمور جیسے جہانسوز کو اس امر

رسلطنت، کا اہل و قابل بتاتے اور سراہتے ہیں بالفاظ دیگر اس فسادی دُنیا کو ٹھیک رکھنے کے لئے امیر تیمور جیسا ہی جہانسوز لازم ہے ؎

اہل کام و ناز را در کوئے رنداں راہ نیست رہروے باید جہاں سوزے نہ خامے بے غمے!

اپنے تئیں عجیب حالتِ غم و الم میں مبتلا پاتے ہیں اپنی مشکلات کی حیرت اور چہ کنم میں کسی عقلمند سے علاج پوچھتے ہیں تو وہ بھی زہر خند کرتا اور کوئی تدبیر بتانے سے عاجز رہتا ہے ؎

زیرکے را گفتم ایں احوال خود خندید و گفت صعب کارے، بوالعجب درد، پریشاں عالمے

آخر ان سب مصائب و مشکلات کا حل تُرکِ سمرقندی (امیر تیمور) کو دل دیدینے (اسکی اطاعت قبول کر لینے میں) دیکھ کر آمادہ بیعت ہوجاتے ہیں ؎

خیز تا خاطر بداں تُرکِ سمرقندی دہیم، کز نسیمش بُوئے جُوئے مولیاں آید ہمے"

جُوئے مولیاں بخارا کا دریا تھا جیسے دلّی کا دریا جمنا ہے "بوئے جوئے مولیاں آید ہمی" یہ مصرعہ رودکی شاعر کے قصیدے کا ہے جو اُس نے شاہ بخارا کو سفر دراز سے واپسی وطن پر ابھارنے کے لئے سُنایا تھا اور اس قصیدے کا شاہ کی طبیعت پر ایسا برقی اثر ہوا تھا کہ وہ فراقِ وطن سے بے چین ہوگیا پورا سننے سے پیشتر ہی گھوڑے پر سوار ہوگیا تھا اور چل پڑا لشکر و ہمراہی پیچھے آتے رہے" حافظ صاحب نے اس مصرعہ کو اپنے مصرعہ میں لے کر امیر تیمور کو (جس نے سمرقند و بخارا کو خالِ کافر پر صدقہ کرنے کا بُرا مانا تھا) یہ حکایت یاد دلائی ہے کہ اگر سچ مچ وطن عزیز ہے تو حُبِّ وطن کا ایسا ہی ثبوت دے یعنی شیراز پر سے دفع بلا ہو۔ مقطع میں خدا اور اس بندۂ خدا یعنی تیمور کی سطوت و جبروت کی کیسی پُر عظمت و شان تصویر دکھائی ہے کہ آپ ہی کا حصہ ہے ؎

ہدیۂ حافظ چہ سازد پیش استغنائے دوست کاندریں طوفاں نماید ہفت دریا شبنمے

زلزلۂ تیمور کے شیراز پہنچنے کے وقت کی ایک اور غزل کے بھی دو شعر سے زین العابدین کے احوال وانجام کی طرف آپ کا انتہائی تعلقِ خاطر ٹپکتا ہے شعر یہ ہے ؎

نگار خویش بدست خساں ہمی بینم | چنیں شناخت فلک حق خدمتے چو منے

دل کو سمجھاتے صبر دلاتے ہیں اور خدا سے اچھی امید لگاتے ہیں ؎

بصبر کوش تو اے دل کہ حق رہا نہ کند | چنیں عزیز نگینے بدست اہرمنے

نگار خویش اور عزیز نگینے سے مراد اپنا بادشاہ زین العابدین اور اہرمن سے مراد امیر تیمور ہے جس کی آندھی کے جھکڑوں میں کیا حالت گلستان فارس خصوصاً اصفہان کی ہو گئی تھی اس شعر میں اُس کا بیان ہے ؎

ازیں سموم کہ برطرف بوستاں بگذشت | عجب کہ رنگے گلے ماند و بوئے یاسمنے

کیسی بلائے بے درماں اور وبائے پُر طوفان نازل ہوئی تھی کہ فکر حکیمی و رائے برہمنی اس کے چارۂ کار میں عاجز و لا العقل تھی ؎

مزاج دہر تبہ شد دریں و با حافظ | کجاست فکر حکیمی و رائے برہمنے!

یہ پوری غزل اس سانحۂ عظیم کے تاثرات سے بھری ہوئی ہے عجیب وقت تھا فرماتے ہیں ؎

بخواہ آئینہ جام و سیر دہر رو ئے بیں | کہ کس بیاد نداد است ایں چنیں فمنے

کیا تباہی اور تباہ کاری تھی کہ ؎

ز تند باد حوادث نمی تواں دیدن، | دریں چمن کہ گلے بودہ است یاسمنے

اس سلسلہ میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ خود حافظ صاحب کے ساتھ امیر تیمور کا کیا سلوک رہا؟ متداول تذکروں میں یہ لطیفہ مذکور ہے کہ جب آپ اُس کے سامنے پیش ہوئے تو امیر نے آپ کے اِس مطلع کی کہ ؎ اگر آں ترک شیرازی الخ" سخت شکایت کی۔ فرمایا کہ میں نے اس قدر

مصیبتیں اُٹھا کر خون بہا کر سمرقند و بخارا کو دنیا کی دولت و عجائبات سے آراستہ و معمور کیا اور تو نے اُسے ایک خال ہندو کا صدقہ بنا یا؟ حضرت نے جواب دیا کہ :۔ "از ہمیں غلط بخشیہاست کہ بایں گدائی رسیدہ ام" بعض تذکروں میں ہے کہ امیر نے دس ہزار روپیہ عنایت فرما کر آپ کو نوازا اور قدر دانی کی" مگر یہ حکایت تراشیدہ اور تیموریوں کے عہدِ حکومت فارس میں اُن کے خوشامدیوں کے امیر پر سے حافظ صاحب کے ساتھ بدسلوکی کا دھبہ مٹانے کی کوشش معلوم ہوتی ہے خود آپ کے ایک شعر سے متبادر ہوتا ہے کہ امیر سخت برا فروختہ ہوا اور آپ پر عتاب کیا۔ شاید شاہ منصور کو جو امیر کا حریف مقابل اور تہمتنِ وقت تھا اور آپ کا مخلص و مربی، جہاں کہیں بھی وہ اُس وقت تھا آپ اُس کو غزل میں یہ شعر بھیجتے ہیں گویا اُس کی دہائی دیتے ہیں ؎

شاہِ ترکاں نہ پسندید و بچاہم انداخت　　چہ کنم دست اگر سوئے تہمتن نہ کنم

اِس موقع پر بھی آپ کے دشمن لگے ہوئے تھے اندیشہ تھا کہ امیر کو بھڑکا کر آپ کو قتل نہ کرا دیں لیکن اگر امیر نے بدگویوں کی بدگوئی پر کان دھرا اور آپ کے خون میں ہاتھ بھر لیا تو یہ ایسا ہی دھبہ اُس کے دامن شہرت پر ہوگا جیسے خونِ سیاوش کا داغ افراسیاب کے دامن پر اُس کی دائمی بدنامی کا موجب ہے لہٰذا امیر کو تنبیہ فرماتے ہیں ؎

شاہِ ترکاں سخن مدعیاں می شنود　　شرمش از مظلمۂ خونِ سیاوش بادا

ضرور یہ غزل آپ نے امیر کے جشنِ پیروزہ کے موقع پر جو ہر فتح کے بعد دستور وقت تھا شیراز کے مغنیوں مطربوں کی زبانی امیر کی محفل میں گوائی اور اُس کے کانوں تک پہنچائی ہے اکثر غزل ہی سے آپ قصیدے کا کام لیا کرتے تھے چنانچہ اس غزل میں امیر کی مدح کے اشعار باوجود میں امیر جشن میں شراب کو جائز سمجھتا اور ایام جشن میں شراب نوشی کی تہ توڑ دیتا تھا کچھ جنسہ

نہ رہتی تھی۔ ساری دلی جو اسوقت سات دلیوں پر مشتمل تغلق آباد سے حویلی پالم تک آباد تھی اور ۱۵ لاکھ سے کم آبادی نہ تھی۔ امیر کے عالم غفلت و بیہوشی میں قتل ہو گئی اور اُسے خبر نہ ہو سکی ورنہ شاید کچھ تدارک کرتا۔ شیراز میں بھی اُس کی یہی کیفیت مینوشی رہی ہو گی لہذا اوّل ایسی اندھا دھند مینوشی سے باز رہنے کی نصیحت کا فرض ادا کیا گیا ہے فرماتے ہیں ؎

صوفی ار بادہ باندازہ خورد نوشش باد — ورنہ اندیشۂ ایں کار فراموشش باد

اِس شعر میں اُس سے کچھ عطا چاہتے ہیں۔ شاید آپ بھی شیراز کی عام تاراجی میں تہیدست مفلس رہ گئے ہیں اِس حسن طلب کا یہ شعر ہے مے سے مراد مبلغ علیہ السلام ؎

آنکہ یک جرعۂ مے از دست تواند دادن — دا ئماً شاہدِ مقصود در آغوشش باد!

اُس کی تعریف فرماتے ہیں دعا کے ساتھ ؎

کیست آں شاہسوارے خوش خرم کہ ز کون — بستہ بند قبائے علم و درویشش باد!

گرچہ از کبر سخن با من درویش نہ کرد — جاں فدائے شکریں پستۂ خاموشش باد

فرماتے ہیں کہ میں نے تیری اطاعت قبول کر لی شاہجہاں کا غلام ہو کر میں بھی مشہور جہاں ہو گیا ؎

بغلامی تو مشہور جہاں شد حافظ — حلقۂ بندگیٔ زلف تو در گوشش باد

انتہائے ظرافت و شوخی سے اِس غزل کے ایک شعر میں تیمور لنگ کے لنگڑے علی ہونے کا اشارہ بھی مار دیتے ہیں مگر عجب انوکھی پیچ پیچ دوشالوں میں لپٹی ہوئی ترکیب اِس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے استعمال کی ہے فلسفہ کا مسئلہ اور قرآن شریف میں اللہ تعالےٰ کا بھی دعویٰ ہے کہ ہر چند غور کیا جائے مگر صنعتِ الٰہی میں زمین و آسمان کے درمیان کوئی فتور و کجی نہیں پائی جا سکے گی"۔ حافظ صاحب اِس سے انکار شاعرانہ کرتے ہیں اللہ میاں سے کہتے ہیں کہ یہ آپ کی نظر کی خطا پوشی ہے اور اغماض، ورنہ تیمور ہی کو دیکھ لیجئے کہ آپ کی قدرت کا خاص الخاص

نمونہ ہے لیکن کجی اُس کی ٹانگ میں موجود ہے عیب و فتور سے خالی نہیں،، اس تعریض کے الفاظ یہ ہیں جن کو اگر تیمور سمجھے بھی تو کہہ کیا سکے۔

پیر ما گفت خطا بر قلم صنع نرفت   آفریں بر نظر پاک خطا پوشش باد

انہی الفاظ میں اللہ میاں پر یہ اعتراض بھی ہو کہ اس بلائے بے درماں کو بنا کر آپ کی قدرت نے بڑی خطا کی ہے لطف یہ ہے کہ آپ کی نظر اس خطا کو دیکھتی بھی نہیں آفریں آپ کی نظر کو!!

امیر تیمور ایک بڑا آہن دل خونریز شخص تھا آپ کی خوشامد درآمد و اقرار اطاعت کے منتر اُس پر نہیں چل سکتے تھے۔ یا چلے تو فقط اتنے ہی چلے کہ آپ کی جان اُس کے ہاتھوں سلامت بچ گئی۔ اس مطلع نے کہ ؎

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل ما را   بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

اس کو حقیقت میں ناراض کیا تھا۔ اس کی ناراضی بجا تھی یہ مطلع اُس کو امرد پرست مشہور کرتا تھا۔ ترک شیرازی یعنی زین العابدین ایک انتہا درجہ کا حسین و خوبصورت امرد شاہزادہ یوسف وقت تھا حافظ کے چند اشعار سے ظاہر ہوتا ہو اسی غزل کا تیسرا شعر ہو ؎

من از آں حسن روز افزوں کہ یوسف داشتم دانستم   کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را

ایک اور غزل میں بھی اُس کو یوسف ثانی کہا ہے بلکہ زبانِ خلائق سے اُسکی سند لائے ہیں ؎

گفتند خلائق کہ توئی یوسف ثانی،   چوں نیک بدیدم بحقیقت بہ ازانی

باوجود متعدد وعدوں کے وظیفہ کا حکم نہ دینے کی اُس سے بھی شکایت ہو خالی باتیں بناتا ہو وعدہ پورا نہیں کرتا ؎

صد بار بگفتی کہ دہم باد ہنت کام،   چوں سوسنِ آزاد چرا جملہ زبانی؟

یہاں نکتہ یہ ہے کہ یہ شاہزادہ بادشاہ ہوکر بڑا کنجوس ثابت ہوا تھا اُمرا تو اُس کی کنجوسی سے برگشتہ ہوکر اُس کے حریفوں سے جا ملنے پر آمادہ ہوگئے تھے خزانے بھرے ہوئے تھے مگر اُس کے دل سے پیسہ نہیں نکلتا تھا حافظ صاحب نے اُس کو اس شعر میں فیاضی و فیض رسانی کی طرف توجہ دلائی ہے ؎

اے نورِ چشمِ من سخنے ہست گوش کُن   تا ساغرت پُر است بنوشان و نوش کُن

مقطع میں فرماتے ہیں ؎

سرمست در قبائے زر افشاں چو بگذری   یک بوسہ نذر حافظ پشمینہ پوش کن

بادشاہ کے دامان قبا کو چومنا اُس زمانے کا دستور تھا۔ بوسۂ رخسار یہاں مراد نہیں

ذیل کے اشعار اسی شاہزادے کی نصیحت میں ہیں جو اکبر کی طرح کم سنی ہی میں بادشاہی کے جلیل مرتبہ پر پہونچ گیا تھا ؎

توانگر برلب جوئے ز ہوس ننشینی   ورنہ ہر فتنہ کہ بینی ہمہ از خود بینی

ایک اور غزل کے یہ اشعار نصیحت جو پہلے بھی گزر چکے ہیں اسی کی ہدایت میں ہیں۔ ازانجملہ وقت کی قدر میں یہ بے بہا نصیحت ایسے سادہ اور جامع و بلیغ الفاظ میں شاید کہیں ملے ؎

وقت را غنیمت داں آنقدر کہ بتوانی   حاصل عمر اے جاں یک دم ست تا دانی

لہو و لعب کی بیکاری فضولی اِس شعر میں جتائی گئی ہے ؎

پند عاشقاں بشنو و ز طرب باز آ   کیں ہمہ نمی ارزد شغل عالم فانی

سواری بے تحاشا دوڑانے میں لوگ جھپیٹ میں آتے ہیں خون ہوتے ہیں اس کو ان الفاظ میں سمجھایا ہے مژگاں سے مراد یہاں ہمراہی جماعت (باڈی گارڈ) ؎

میروی و مژگانت خون خلق میریزد   تُند میروی اے جاں ترسمت فرومانی

مرنے سے پیشتر اس شہزادے کا باپ شاہ شجاع امیر تیمور کو اُس کا ولی اور سرپرست مقرر کر گیا تھا باپ کے مرنے پر چچاؤں نے اُس سے ملک چھینا اور ستانا شروع کیا اُس کنجوسی سے تو تنگ آکر امیروں نے اُن سے موافقت کے ارادے کئے اور خدا جانے کیا کیا حالات پیش آئے یہاں تک کہ امیر نے بحیثیت ولی و مربی نصیحت نامہ لکھ کر اُس کو اپنے پاس سمرقند طلب کیا تھا اور اُس کو مع اُس کے ملک کے اپنی حمایت میں لے لینا چاہا۔ زین العابدین اسپر راضی نہ ہو سکتا تھا اُس کے ایک خالو بھی تھے جو کرمان کے حاکم اور امیر کے اس پیام کو بھلانے سے منوا دینے میں شاید ساعی بھی ہوں ان سب باتوں اور زین العابدین کے حسن کو ذہن میں رکھکر اس مطلع کو کہ ؎ اگر آں ترک شیرازی بدست آرد الخ، پڑھیے تو لطف در لطف بڑھ جاتے ہیں۔ امیر تیمور کی زبان سے اُس کی صلاح سمرقند کو مان لینے کا صلہ اُس کے خال (یا ماموں) کو سمرقند و بخارا بخش دینے اور نثار کر دینے کا ایسا گویا دانستہ ناخواستہ اقرار نکلتا ہے جسکی وجہ سے تیمور اس مطلع کو کانوں سے سن سکتا نہ زبان سے دہرا سکتا تھا۔ ان امور کو ذہن نشین رکھ کر سمجھنے سے پوری وجہ امیر کی اس مطلع سے انتہائی برہمی کی عیاں ہو جاتی ہے۔ اُس نے جب شیراز کو آن کر لیا ہے تو زین العابدین تو اپنے چچا شاہ منصور کے پاس بھاگ گیا تھا لیکن حضرت حافظ صاحب کو جوابدہی اپنی شوخی کی کرنی پڑی آپ نے جواب میں ہر چند یہ لطیفہ و لغز جھاڑا کہ:۔ "از ہمیں غلط بخشیہاست کہ باین بینوائی رسیدہ ام" لیکن ایسے منتر امیر کے سخت دل پر کارگر ہونے والے نہ تھے بس غنیمت ہوا کہ آپ کی جان سلامت بچ گئی!

امیر تیمور جیسا آندھی کی طرح آیا تھا ہوا کی طرح نکل گیا اُس کے جانے کے بعد شاہ یحییٰ اور شاہ منصور کے شیراز میں دور دورے رہے تھی جب شیراز میں تیمور بٹھا کر گیا تھا اُس کو منصور نے مار بھگایا۔ اگرچہ شاہ یحییٰ کی بھی ستائش کے شعر دیوان میں پائے جاتے ہیں ؎

دارائے جہاں نصرتِ دیں خسرو کامل — یحییٰ بن مظفر ملک عالم و عادل
اے آنکہ در اسلام پناہی تو کشودہ — بر روئے جہاں و زنہ جان و تن و دل
حافظ قلمِ شاہ جہاں مقسم رزق است — از بہرِ معیشت مکن اندیشۂ باطل

ایک اور غزل میں فرماتے ہیں ؎

گر نبودے شاہ یحییٰ نصرت الدین از کرم — کار ملک و دیں ز نظم و انتساق افتادہ بود

لیکن منصور سے آپ کے روابط خاص تھے اُس کی آمد پر بڑے جوش و شادمانی میں یہ غزل لکھی ہے ؎

بیا کہ رایتِ منصور بادشاہ رسید — نوید فتح و ظفر تا بہ مہر و ماہ رسید
جمالِ بخت ز روئے ظفر نقاب انداخت — کمالِ عدل بفریاد دادخواہ رسید
سپہر دور خوش اکنوں کند کہ ماہ آمد — جہاں بکامِ دل اکنوں رسد کہ شاہ رسید الخ

منصور ہی کے عہد کی یہ غزل بھی ہے ؎

گرچہ ما بندگان بادشہیم — بادشاہانِ ملک صبحگہیم

اپنی ناداری و وفاداری ظاہر کرتے ہیں اِس طرح ؎

گنج در آستین و کیسہ تہی — جام گیتی نما و خاک رہیم
شاہ بیدار بخت را ہر شب — ما نگہبان افسر و کلہیم

منصور کے بہادر و شجاع ہونے میدان میں ڈٹ کر لڑنے قدم نہ ہٹانے کی شہرت کو اپنے اوپر اوڑھ کر عجب یگانگت کے انداز میں اُس کی مدح فرماتے ہیں یہ شعر واقع میں منصور کی تعریف میں ہیں جنھیں حافظ صاحب نے خود اپنی مدح بنا کر پیش کیا ہے ؎

شاہ منصور واقف است کہ ما — روئے ہمت بہر کجا کہ نہیم

دشمناں را زخوں کفن سازیم　　　　دوستاں را کلاہ فتح دہیم

یہ شعر بھی جو غالب کی نظر سے انتخاب دیوان ہر اسی غزل کا ہے

رنگ تزویر پیش ما نرود　　　　شیر سرخیم و افعی سیہ ایم

اپنی بقایا وظیفہ کو خزانے سے دلا دینے کے وعدے کو یاد دلاتے ہیں

دام حافظ بگو کہ باز دہند　　　　کردۂ اعتراف ماگوہ ایم

منصور کے عہد کی غزلوں میں آپ کو اُس سے نہایت اخلاص اور اُس کی عقیدت و مہربانی پر ناز معلوم ہوتے ہیں آپ اُس کے مشیر مؤتمن بھی پائے جاتے ہیں

الا اے طوطیٔ گویائے اسرار　　　　مبادا خالیت شکر ز منقار

سخن سربستہ گفتی با حریفاں　　　　خدا را زیں معما پردہ بردار

یہ ساری غزل زبان اسرار میں ہو ایسا معلوم ہوتا ہی کہ منصور نے کچھ کیفیت بعض اشارات میں لکھ کر شکر کے کسی مقام سے بھیجی ہے آپ اُس کا مطلب صاف نہیں سمجھ سکے ہیں شعر دوم کے مصرعہ ثانی میں تشریح مطلب چاہتے ہیں ع

خدا را زیں معما پردہ بردار"

فارس کی آزادی کو امیر تیمور کی دست برد سے منصور بچائے ہوئے تھا اُس سے معرکوں میں جیت رہا تھا آپ اُس کی سلامتی کی دُعا کرتے ہیں

خداوندی بجائے بندگاں کرد　　　　خداوندا ز آفاتش نگہدار

تیمور سے خوف زدہ تھے اِس شعر میں اُس سے حذر کا اظہار ہے اور زبان اسرار میں اُسے بُتِ چینی کا لقب دیا ہو اُس کا وطن (گورگاں) چینی ترکستان میں تھا

بُتِ چینی عدوئے جان و مال ست　　　　خداوندا دل و دینم نگہدار

مقطع میں اپنی شہرت کا جھنڈا بھی لہرا دیا ہے ؎

بیُمن دولتِ منصور شاہی   علم شد حافظا اندر نظمِ اشعار!

اِس غزل سے مترشح ہے کہ تیمور اور منصور میں عنقریب وہ آویزش ہونے والی تھی جس میں منصور ایسی بہادری اور بے جگری سے خاص ذاتِ تیمور پر حملہ کرتا ہوا مارا گیا کہ تیمور نے بھی اُس کے تہور کی داد دی!

متداول تذکروں میں امیر تیمور کے آخری حملے کے وقت حافظ صاحب کو زندہ بقیدِ حیات تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ مگر اُن تمام واقعات سے جو اوپر امیر تیمور کے متعلق بحث میں آئے حضرت حافظ کا امیر کے ہاتھوں شیراز کی بربادی دیکھنا اور اُس کی اطاعت قبول کرنا ثابت ہے لہٰذا آپ کی تاریخ وفات ۷۹۲ھ ہجری جو "خاکِ مصلےٰ" کے حروف سے استخراج کی جاتی ہے غلط ٹھیرتی ہے جو قطعۂ تاریخ مولانا گلندام کے دیباچے میں نقل ہوا ہے وہ صحیح معلوم ہوتا ہے ذیل میں ہم اس کو نقل کرتے ہیں:۔

بسالِ صاد و دال و بائے ابجد   ز روزِ ہجرتِ میمونِ احمد

بسوئے جنتِ الاعلےٰ رواں شد   فریدِ العہد شمس الدین محمد

صاد اور دال اور بائے ابجد کے عدد ۷۹۶ ہوتے ہیں جو ۷۹۶ھ ہجری کا مخفف ہیں اور اسی کو صحیح سمجھنا چاہئے ورنہ آپ تیمور کے آخری حملہ میں جب کہ شیراز کو اُس نے فتح و تاراج کیا یعنی ۷۹۵ھ ہجری میں بقیدِ حیات ثابت نہیں ہو سکتے اور یہ بڑا بھاری غلطہ ہے

مولانا گلندام کے اِس قطعۂ تاریخ میں حافظ صاحب کا نام فریدِ العہد شمس الدین محمد" کے مقدس القاب کے ساتھ لیا گیا ہے۔ محمد آپ کا نام شمس الدین لقب آپ کی حیات میں اکابرِ وقت نے آپ کو دیدیا تھا۔ ایسا لقب کسی رندِ میخوار کو ہرگز ہرگز نہیں دیا جا سکتا تھا۔ ہم نے یہ لقب آپ کے

عہد حیات سے قریب تر ہی نقل شدہ انتخاب دیوان کے سر ورق پر بچشم خود دیکھا ہے اس نسخہ دیوان کا آتا پتا پہلے آچکا ہے دیکھو صفحہ ۱۱۸ روشن خیالان حال کو جو حافظ صاحب کی نسبت یہ رائے رکھتے ہیں کہ بڑے رند و میخوار تھے خوب پیتے اور مزے کرتے تھے" اپنی اس روشن خیالی اور تحقیق پر شرمانا چاہیئے!

اسلامی فرقوں میں سے آپ کس فرقے کے مقلد تھے خصوصاً سُنی تھے یا شیعہ؟ یہ بھی ایک سوال آپ کی نسبت بحث میں آجاتا ہے۔ آپ دونوں فریق کے محبوب تھے اور محبوب ہیں۔ شیعہ آپ کی شیعیت کی سند میں یہ اشعار پیش کرتے ہیں ؎

حافظ اگر قدم زنی در رہ خاندانِ عشق — بدرقہ رہت شود ہمتِ شحنۂ نجف رضؓ

حافظ بجاں مطیع محمدؐ و آلِ وست — دارم بریں گواہ خداوندِ اکبرم

سُنی پہلے شعر میں عشق کے لفظ سے درویشی مراد لیتے ہیں کہ ان معنی میں یہ لفظ دیوان میں صدہا بار استعمال ہوا ہے خاندانِ عشق سے طریقہ تصوف یا خانوادہ صوفیہ جس کو بذریعہ خواجہ حسن بصریؒ حضرت علیؓ شاہ ولایت تک پہنچایا جاتا ہے لہذا در رہ خاندانِ عشق کے معنی طریقۂ تصوف و معرفت میں رہروی کے لیتے ہیں۔

دوسرا شعر شاہ منصور کی شان میں نوشتہ قصیدے کا ہے چنانچہ قصیدے کے اس شعر میں اُس کا نام معہ ولدیت (محمد مظفر) موجود ہے ؎

منصور بن محمد غازی ست حرزِ من — وز ایں خجستہ نام بر اعدا مظفرم

اِس قصیدے کے لکھنے کی وجہ و علت منصور کے دل میں آپ کی وفاداری کی نسبت اگر کچھ شک ہو تو اُس کا مٹانا مقصود ہے چنانچہ شروع قصیدہ ہی سوگند و قسم کے ساتھ ایک حلف وفاداری کے اظہار و اقرار میں ہے ؎

جُوزا سحر نہاد حمایل برابرم — یعنی غلام شاہم و سوگند می خورم

مقطع میں بھی یہی یقین دلایا ہے جو مطلع میں کہ ؎ حافظ بجاں مطیع محمدؐ وآل اوست الخ"

آل سے مراد اہل بیت اطہار بھی ہیں کہ ہر مسلمان پر سُنی ہو خواہ شیعہ اُن کی محبّت واجب ہو اور آل مظفر بھی جس کے کئی افراد متواتر شیراز و فارس میں حکمراں رہے تھے۔ سُنی حافظ صاحب کا یہ شعر آپ کے سُنّی ہونے کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں ؎

من ہماں دم کہ وضو ساختم از چشمۂ عشق — چار تکبیر زدم یکسرہ بر ہر چیز کہ ہست

چار تکبیریں جنازے کی نماز میں سُنیّوں کے ہاں ہیں شیعوں کے ہاں نہیں۔

آپ کے جامع کلام اور ہمعصر مولٰنا گلندام کے دیباچے سے ظاہر ہے کہ آپ قوام الملّت والدّین مولانا عبداللہ کے مدرسہ میں صاحب درس و سادہ تھے اور اُس میں آپ کے ذکر لیے (درس) سننے گلندام بھی اکثر جایا کرتے تھے۔ یہ مدرسہ یقیناً سنیوں کے علوم اور علماء کا مدرسہ ایک سنی وزیر کا قائم کردہ تھا لازماً ظاہر ہے کہ سنیّوں کے مدرسے میں کسی شیعہ عالم کو امام و سجادہ نشین مقرر نہیں کیا گیا ہوگا۔

آپ کے قطعات تاریخ میں ایک قطعۂ تاریخ آپ کے بھائی کی وفات کا دیوان میں موجود ہے جس میں اپنے بھائی صاحب کو خود آپ نے "امامِ سنّت" ظاہر کیا ہے فرماتے ہیں ؎

برادر خواجہ طالب طاب مثواہ — امامِ سنّت بعد از ممالکش

بسوئے روضۂ رضوان رواں شد — پس از پنجاہ و نہ سال از حیاتش

خلیل عادلش پیوستہ برخواں — وز آنجا فہم کن سال وفاتش

اِن سندات سے فیصلہ کیا جا سکتا ہے اور آپ سُنی یا شیعہ ثابت کئے جا سکتے ہیں قطعۂ تاریخ منقولہ بالا کے بموجب آپ کے بھائی خواجہ طالب نے ۷۷۵ھ ہجری میں ۵۹ سال کی

عمر میں انتقال کیا وہ سال انکی عمر کے سال وفات میں سے وضع کرنے سے سال پیدائش خواجہ طالب کا ۷۱۱ھ
ظاہر ہوتا ہے حافظ صاحب اُن سے عمر میں چند ایک سال چھوٹے یا چند ایک سال بڑے ہوں گے قطع کے لہجہ سے
اور پیشتر انتقال کرنے سے انکا عمر میں حافظ صاحب سے بڑا ہونا مرجح ہے پس حافظ صاحب کی پیدائش سنہ ۷۱۵ھ سے
سنہ ۷۲۰ھ تک کسی سال میں قرین قیاس تصور کیجا سکتی ہے۔ آپ کے کلام سے بھی اسکی تائید ہوتی ہے اس طرح
کہ عہد مظفریہ میں دو ایک سال ممانعت شراب برقرار رہکر عہد شجاع میں قریب سنہ ۷۶۰ھ کے جب شراب پھر کھلی اور یہ
تاویلات کیگئیں کہ شراب مطلقاً حرام نہیں معالجوں میں کارگر ہوتی ہے دوا مفید ہے وغیرہ حافظ صاحب نے ان تاویلات
کے جواب میں یہ شعر نغز داخل غزل فرمایا جو طنز کی جان اور شوخی و ظرافت کا عجیب و غریب نمونہ ہے ؎

چل سال رنج و غصہ کشیدیم و عاقبت ... تدبیر ما بدست شراب دو سالہ بود

یعنی چالیس سال عمر کے تکلیف و رنج میں مفت ضائع کرکے آخر معلوم ہوا کہ ہمارے مرض کا علاج شراب میں تھی جو دو سال بند رہی تھی
سنہ ۷۶۰ھ یعنی شراب کی ممانعت کی برطرفی کے وقت آپکی عمر مصرعہ اول کے لحاظ سے اگرچہ چالیس سال
تصور کیجائے اور ۷۶۰ میں سے ۴۰ سال عمر کے وضع کئے جائیں تو اس طریق استدلال و استقرا سے بھی سنہ ۷۲۰ھ
آپکی پیدائش کا تخمینی سال بہم پہنچتا ہے۔ ہر دو طریق سے آپکی پیدائش سنہ ۷۲۰ھ کے قریب ثابت ہوتی ہے سن وفات
سنہ ۷۹۱ھ ہم اوپر ثابت کر آئے ہیں۔ اس لحاظ سے آپ نے صرف ۷۱ برس کی عمر پائی لیکن پیری میں خمیدہ قامت
دوتا مثل کمان و ہلال ہو جانے کی طرف ایک سے زیادہ اشعار میں اشارے کئے ہیں ؎

قد خمیدہ ما سہلت نماید اما ... بر چشم دشمنان تیر از کمان توان زد
در نحیفی و نزاری تن بیچارہ من ... چون ہلالیست کہ انگشت نما می گردد

حافظ صاحب ایک اچھے خاندان سے تھے جو سالہا سال اور پشتہا پشت سے نیکنام چلا آتا تھا

اس شعر سے عیاں ہے ؎

ناموس چند سالہ اجداد نیکنام ... در راہ جام و ساقی مہرو نہادہ ایم

خاتمۃ الکلام

کسی مستشرق کا یہ مقولہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ خیام اور حافظ کے حالات اس قدر کم معلوم ہیں کہ اگر کوئی اُن میں ایک سطر کا بھی اضافہ کر دے تو دنیا پر بڑا احسان کرے" اُس مستشرق کو اور خود ہم مشرقیوں کو اب تک یہ بہت کم معلوم و محسوس تھا کہ حافظ صاحب کے متعلق تمام چیدہ حالات خود اُن کے دیوان میں موجود اور اشعار میں منتشر ہیں البتہ رنگ تغزل سے جس میں وہ بضرورت رنگے ہوئے ہیں اُن کو نتھار دے کر نکھارنا استعارات وغیرہ سے جدا کر کے اُس عہد کی تاریخ و واقعات کی روشنی میں کام بکھری ہوئی کڑیاں ملا کر پوشیدہ تلمیحات کو پیدا کرنا ایک نہایت غور طلب اور مشکل کام تھا جس پر سے اُن کے سوانح نگار روانی کے ساتھ گزر گئے۔ ہم کو آپ کے دیوان کا اُردو نظم میں اصل کے بحر و قافیے کی امکانی پابندی کے ساتھ ترجمہ کرنے کے اثنا میں (جو شایع ہو کر تحسین سے شاد کام ہو چکا ہے) اس غور کا قدرتی موقع مل گیا مفہوم و معنی کو پہنچنے کے لئے ایک ایک شعر پر ٹھہرا رہنا پڑا ہر لفظ و ترکیب کا مساوی اُردو میں پانے کے لئے اُس کو ذہن میں رکھ کر گردش دیتے رہنے کا مہینوں برسوں اتفاق رہا آخر بہت سا حصہ کلام بیک وقت مستحضر ہو جانے سے اکثر منتشر حالات کی کڑیاں اُسی کلام میں مل گئیں اور ہجوم استعارات وغیرہ میں اُن کے سلسلے پا گئے نتیجہ اس تحقیق و تدقیق کا اس مقالہ کی صورت میں پیش ہو رہا ہے۔ اکثر ہمارے استدلات اور مستنبطات سے انکار محال ہوگا کسی کسی موقع پر جہاں ہم نے مبادرت کی ہے یعنی اُس درک کی بناء پر جو مدید مزاولت سے پیدا ہوتا ہے۔ بھروسہ کیا ہے اعتبار کرنا ہوگا۔ بالفاظِ دیگر نکتہ چینی کی گنجائش ہوگی، سو وہ کہاں نہیں ہوتی۔ بہرحال ؎

گرت باور بود ور نہ سخن این بود وما گفتیم

یہ مقالہ کلام حافظ کو اِس زمانے والوں کے لئے ایک نئی روشنی میں پیش کرتا ہے حافظ صاحب

کے اندازِ بیان اور اُس میں اُن کے طرزِ ادائے واقعات کو بہت کچھ روشن کرتا ہے جو روشنی اُس سے پڑتی ہے اُس کے اُجالے میں اکثر کلام کے لطائف و نکات جو احاطے سے خارج ہیں اور مزید تر حالات آئندہ کاوش کرنے والے برآمد کر سکیں گے اُن عنوانات پر بھی جن کو اس مقالے میں چھیڑا گیا ہے دیوان میں مزید اشعار و غزل بکثرت موجود ہیں اور جدید عنوانات پانے کی بھی گنجائش باقی ہے یہ نمونہ ایسی کوشش میں بہت کچھ مفید رہنمائی ہو سکے گا۔ لیکن آپ کے کلام میں تحقیقات کے لئے ذرا واقفِ منزل رہنا ضروری ہے یعنی جو کچھ آپ کے اور آپ کے عہد کے متعلق تاریخوں تذکروں روایتوں وغیرہ میں جابجا موجود منتشر ہے اُس کا کچھ علم و معلومات شرط ہے مثلاً اس شعر کے مخفی معنی کی نسبت ایک یورپین کا گمان ہے کہ ہمائی کلاس لیڈیز کا شب کو آکر ملاقات کرنا مراد ہے :-

ساکنانِ حرم سترِ عفافِ ملکوت ‌ ‌ ‌ ‌ با منِ خاک نشیں ساغرِ مستانہ زدند

اگر ایسے کوئی معنی پوشیدہ ہوں تو عجب نہیں حافظ صاحب کا شعر بیک وقت تصوف کی آیتہ بھی ہوتا ہے غزل کا شعر بھی بیانِ واقعہ بھی۔ واقعہ کی نظر سے حافظ صاحب کے پاس ملائکہ ہفتم آسمان کا نازل ہونا تو باور نہیں کیا جا سکتا ۔ ساکنانِ حرم عفافِ ملکوت، سات پردوں میں رہنے والے ہی ہو سکتے ہیں الفاظ محترم ترین حرم پر دلالت کرتے ہیں اور وہ حرمِ محترم بادشاہ اور ملکہ ہی ہو سکتے ہیں مگر اُنھیں حافظ صاحب کے پاس آنے کی کیا پڑی تھی؟ اگر کوئی اُس کی تحقیق کے پیچھے پڑنا چاہے تو اُسے یہ واقعہ تاریخی مستحضر ہونا چاہیئے کہ شاہ شجاع (فرمانروائے شیراز) کے کسی دور دست جنگ یورش کے اثناء اور شیراز سے غیر حاضری کے ایام میں اِس کے بھائی محمود (فرمانروائے اصفہان) نے موقع خالی پاکر شیراز کو آن دبایا تھا شجاع کی ملکہ نے اِس موقع پر نہایت مردانہ جلادت سے کام لیا محاصرے کے دفاع کا انتظام و بند و بست اس خوبی سے رکھا کہ محمود شہر میں داخل نہ ہو سکا فصیل کے مورچوں پر ملکہ خود بنفسِ نفیس

گشت لگاتی اور راتوں کو پہرہ چوکی دیکھتی پھرتی تھی۔ اپنے شب گشت میں اگر کسی شب کو ملکہ نے مع اپنی مصاحبوں اور مخدرات محل کے حافظ صاحب کا دروازہ جا کھٹکٹایا ہو اور اُن سے اِس معاملے کے بیچ میں پڑنے اور محمود کو باہمی جنگ سے باز رکھنے کی استدعا کی ہو تو یہ ایک بالکل قرین قیاس امر ہے علم و فضل و شیریں کلامی و طلاقت لسانی اور شاہانِ وقت کی مزاج شناسی بارازہی ندیمی نیز اپنی مقبول زمانہ شاعری کے ذریعہ جو رسوخ اور ہر دلعزیزی آپ کو حاصل تھی وہ سب اس کی مقتضی تھی کہ ایسی ضرورت کے وقت آپ کی قابلیتوں اور اثر سے استفادہ کیا جائے چنانچہ ملکہ کے ناوقت ناگہاں پہونچکر دستک دینے کو مطلع میں ؎ دوش دیدم کہ ملایک درِ میخانہ زدند[۱] سے استعارۃً سمجھ سکتے ہیں۔ دوسرے شعر میں ملکہ اور اُس کی ہمراہی مخدراتِ عصمت کو ؎ ساکنانِ حرم سِرِ عفافِ ملکوت الخ کہا ہی گیا ہے اور شعر اوپر گزر چکا ہے، آیندہ شعر یعنی ؎

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید　　　قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

میں بارِ امانت کو وہ فرض تصور کیا جا سکتا ہے جس کا بوجھ اور بڑوں بڑوں کو چھوڑ کر آپ کے کندھوں پر ملکہ کی طرف سے رکھ دیا گیا تھا یعنی محمود کو سمجھا بجھا کر صلح کرا دینے کا فرض و مشن۔ چنانچہ ملکہ کی حسب مراد صلح ہو گئی محمود محاصرہ اُٹھا کر واپس چلا گیا اِس کامیابی پر جو جشن و سرور اور رقص و سرود ملکہ کی محل میں ہوئے ہونگے اس شعر میں اُن کی جھلک ہے ؎

شکرِ ایزد کہ میانِ من و او صلح فتاد　　　حوریاں رقص کناں ساغرِ شکرانہ زدند

اِس غزل کے یہ دو شعر بھی کہ ؎

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ　　　چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

---

[۱] گِلِ آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند" میں اس پارٹی کو اُن فرشتوں سے بھی تشبیہہ دیگئی ہے جنہوں نے اپنے مرتبے سے فروتر آکر آدمیوں کی طینت اور اخلاق اختیار کر لئے تھے۔

با بصد خرمن پندار ز ره چوں نرویم　　چوں رہِ آدمِ خاکی بہ یکے دانہ زدند

ہر دو شعر حقیقت کی نافہمی سے ہم جنس برادروں کے آپس میں جھگڑنے اور نفسانیت کے فریب میں آجانے کے عذر و توجیہہ میں ہیں۔ مقطع ؎

کس چو حافظ نہ کشید از رخِ اندیشہ نقاب　　تا سرِ زلفِ عروسانِ سخن شانہ زدند

اس میں حافظ صاحب اپنے اس کمالِ شاعری پر خود نازاں نظر آتے ہیں کہ کیسے عجیب و دلچسپ پیرایے اور حقایقِ معرفت کے پردے میں انھوں نے اس سارے واقعہ کو دہرا دیا ہے کہ عروسانِ سخن کی زلفوں میں شانہ کشی کا جب سے آغاز ہوا یعنی غزل گوئی کی تمام تاریخ میں اس کی مثال نہ ہوگی۔" مقطع میں الفاظ عروس و شانہ و زلف، عروسِ مملکت یعنی بادشاہ بیگم کی رعایت سے لایا گیا ہے جو بڑی قابل و فاضل ملکہ کہی جاتی ہے اس غزل کا کمال غالباً اسی کو جتایا گیا اور اسی نے ان اشعار کے پوشیدہ مطلب کو بخوبی سمجھا ہوگا اور لطف اندوز ہوئی ہوگی۔

اگر مذکورہ بالا تشریح و تاویل اس غزل کے اشعار کی واقعتاً بھی صحیح ہو۔ اگرچہ مطابقِ واقعہ ہونے کے امکان سے کچھ خارج بھی نہیں تو ہم بھی اس مطلع کو اسی لہجہ میں یوں گا سکتے ہیں ؎

کس نے یوں [illegible] تھی حافظ ترے معنی کی نقاب　　شانہ کش جب سے ترے زلفِ سخن میں ہے قلم!

کلامِ حافظ کو ہم نے اردو میں بھی بے نقاب یعنی اصل کے بحر و قافیہ میں منظوم ترجمہ کر دیا ہے۔

تمام شد

مطالعۂ حافظ نوشتۂ مولوی محمد احتشام الدین صاحب ایم۔اے (علیگ) دہلوی
حویلی مفتی اکرام الدین خاں مرحوم
تراہا بیرم خاں۔ دہلی

(بقلم تلمیذ الحسن خاں شیرپوری)
۱۳۵۸ھ